قیمت : -/10 روپے

ماہنامہ

اردو دنیا

قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید چارج لینے کے بعد اپنے آفس میں۔

قومی اردو کونسل کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید اور ڈائرکٹر لینگویجز محترمہ رشمی چودھری جو کونسل کے ڈائرکٹر انچارج کی ذمے داری بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔۔۔ پھولوں اور مسکراہٹوں کا تبادلہ۔

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 5

تعارف

● ڈاکٹر علی جاوید — اجمالی تعارف .... مخمور سعیدی 6

زبان اور تعلیم

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمن فاروقی 7

● املا اور تلفظ کے کچھ مسائل .... سالکہ خاتون صدیقی 9

● اردو زبان کی تعلیم اور علاقائی زبانیں .... کلیم ضیا 12

● مدارس کی جدید کاری .... محمد جہانگیر وارثی 14

ادب

● اردو کا شاہکار ناول — کئی چاند تھے سرِ آسماں .... احمد محفوظ 15

● یونان کا کلاسیکی ڈراما .... غلام نبی خیال 21

● افسانوی ادب کا ترجمہ .... ابوالکلام 24

● نابینا .... عابد سورتی 26

تاریخ

● آثارِ فیض آباد .... تنویر سلطانہ 32

سماجیات

● مزدور بچے .... فروغ صباجامی 34

شخصیت

● ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر .... افتخار الزماں 35

تربیت اطفال

● ہم اور ہمارے بچے .... رضوان رضوی 37

درخواست نگاری

● درخواست نویسی کے رہنما اصول .... سید فضل اللہ مکرم 39

ہماری مطبوعات سے

● مونالیزا .... قرۃ العین حیدر 41

اردو خبرنامہ .... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73

بچوں کا گوشہ

● حضرت امیر خسرو کی چند پہیلیاں .... محمد افضل خاں 78

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔9، شمارہ۔5 مئی 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:

ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6

آر۔کے۔ پورم نئی دہلی- 066 110

فون: 26103938, 26103381

فیکس: 26108159, 26179657

ویب سائٹ:

http://www.urducouncil.nic.in

email: ncpuleditorial@yahoo.co.in

urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،

آر۔کے۔ پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22 قمر ڈاکٹر، ساجد پارکنگ کمپلکس،

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

آپ کی بات

■ ریاض جعفری، صدر امیر خسرو سوسائٹی، 43، ریولس ووڈ روڈ، لندن E179LY (یو کے)

آپ کا خوبصورت معلوماتی اور اردو ادب کا مایۂ ناز ماہنامہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ ہم اسے پڑھنے کے بعد اپنی مقامی لائبریری میں رکھوا دیتے ہیں تاکہ دیگر ہندوستانی اور پاکستانی شعرا اور ادبا بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ ہم آپ کے اس نیک کام کے لیے آپ کے بہت ممنونِ احسان ہیں۔

■ محمد شاہد پٹھان، ٹی آر-22، راجستھان یونیورسٹی کیمپس، جے پور-302004

''اردو دنیا'' اپریل 2007 موصول ہوا۔ ''ہماری بات'' کے تحت آپ نے صحافت کی اہمیت و معنویت اور اس کے تاریخی کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ حکومت ہند سے یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ فدایانِ وطن قلم کاروں کی یادگاریں بھی قائم کرے، جنھوں نے آزادیِ وطن کے لیے جان و مال کی قربانیاں دی ہیں۔ 1857 سے لے کر 1947 کے درمیان ظاہر ہے کہ مختلف زبانوں اور مذاہب کے متعدد قلم کار اور صحافی ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے اعلانِ حق و آزادی کی پاداش میں اپنی جانیں قربان کی ہیں۔

مضامین میں، ''کتنے پاکستان۔ ایک مطالعہ'' از چندر بھان خیال، ''بنگال، نشاۃ ثانیہ اور اردو'' از ابوبکر عباد، ''1857 کی جنگ آزادی اور لکھنؤ'' از اروند کمار ترپاٹھی اور ''انگریزی زبان پر عربی کا اثر'' از محمد سراج الدین حاصل شمارہ ہیں، یہ مضامین، مضمون نگاروں نے محنت اور تجسس کے ساتھ لکھے ہیں محمد سراج الدین نے عربی الفاظ کا یورپی زبانوں میں تداخل اور تاریخی طور پر ان کے استعمالات کے منہاج و مدارج کا جس گہرائی سے جائزہ لیا ہے وہ ان کی ژرف نگاہی کا بین ثبوت ہے۔ چندر بھان خیال نے ''کتنے پاکستان'' ناول کا کماحقہٗ جائزہ لیا ہے، میری محدود معلومات میں شاید، ''آگ کا دریا'' ناول کے بعد کملیشور کا ناول ''کتنے پاکستان'' اپنی اسلوبی تکنیک کے اعتبار سے دوسرا منفرد ناول ہے، اسے ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے محترم ڈاکٹر خورشید عالم واقعتاً لائق تحسین ہیں۔ ''1857 کی جنگ آزادی اور لکھنؤ'' مضمون کے آخر میں ''واجد علی شاہ اور حضرت محل'' کا تذکرہ شامل ہے تاریخ کی کتب میں روایت ہے کہ حضرت محل دراصل جان عالم کی نکاحی نہیں بلکہ متاعی ازدواج میں سے ایک تھیں۔ حضرت محل ابتدا خواصوں میں شامل ہوئیں، واجد علی شاہ نے ایامِ ولی عہدی میں ان سے متعہ کیا اور ''مہک پری'' کا خطاب دیا، وہ حاملہ ہوئیں تو ''افتخار النسا'' کے خطاب سے سرفراز ہوئیں، 13 فروری 1847 کو جب جان عالم تخت نشین ہوئے تو افتخار النسا کو ''نواب حضرت محل'' کا خطاب عطا ہوا۔ اسی مضمون میں بہرائچ ضلع کے ''بونڈی قلعے'' میں حضرت محل کے قیام کا ذکر ہے یہ دراصل ''بونڈی قلعہ'' ہے، کتب تاریخ میں بونڈی نہیں بلکہ بونڈی درج ہے، ''بونڈی ریاست'' راجپوتانہ کی ایک ریاست رہی ہے اور اب یہ بونڈی راجستھان کا ایک ضلع ہے یہاں تاریخی قلعہ بھی موجود ہے۔

■ ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، شعبۂ اردو، مہاراشٹر اودے گیری کالج، اودے گیر-413517، ضلع لاتور، مہاراشٹر

اپریل کا ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ مستقل کالم ''اچھی اردو: روزمرہ محاورہ صرف'' بے انتہا مفید ہے۔ اس کالم کے ذریعے اردو زبان کا روزمرہ، صرف و نحو، الفاظ کے مختلف معنی اور ان کے استعمالات غرض بہت ساری مفید معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔ اس کالم کی شروعات کے لیے قارئین ادارے اور فاروقی صاحب کے ممنون ہیں۔

زیر نظر شمارے کے تمام مشمولات کارآمد اور لائق مطالعہ ہیں ''انگریزی زبان پر عربی کا اثر'' اور ''کتنے پاکستان — ایک مطالعہ'' یہ دونوں مضامین خاص طور پر پسند آئے۔ مرحوم کملیشور کے ناول ''کتنے پاکستان'' پر فاضل مضمون نگار نے نہایت عمدہ اور جامع مضمون قلمبند کیا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے ناول کے موضوع، مواد اور اسلوب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ''اردو خبرنامہ'' ایسا کالم ہے جس سے ساری اردو دنیا کی مختلف سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

■ جے۔ ایم۔ مہتا، جے-186، ساکیت، نئی دہلی-110017

''اردو دنیا'' کے اپریل کے شمارے میں ''ہماری بات'' میں آپ نے جنگِ آزادی کے ڈیڑھ سو سال کے جشن کا ذکر کیا ہے اس میں دو رائے نہیں کہ جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دیں ان کو نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے بلکہ بے مثال کارناموں کی طرف توجہ دلانے کے لیے کچھ عملی اقدام بھی کیے جائیں۔ میں ''اردو دنیا'' کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ پہلے ہی اس سلسلے میں

کچھ نامور ہستیوں کے بارے میں مضامین شائع کر چکا ہے دسمبر 2006 میں مولوی محمد باقر جنوری 2007 میں نیتاجی سبھاش چندر بوس۔ فروری 2007 میں مجاہد آزادی چندر شیکھر آزاد اور مارچ 2007 میں سروجنی نائیڈو۔ یہ کچھ مثالیں ہیں۔ امید ہے آپ اس سلسلے کو آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ زبان سادہ اور سلیس ہو۔ اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ مثال جناب محمد عرفان نے ''ترانۂ اردو'' کے ذریعے اپریل کے شمارے میں پیش کی ہے۔ کوئی بھی زبان اگر سادہ اور سلیس نہیں ہوگی تو عوام تک نہیں پہنچ پائے گی۔

■ **محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد-503002 (آندھرا پردیش)**

اپریل 2007 کا اردو دنیا بروقت موصول ہوا۔ یہ رسالہ اردو والوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں اردو داں طبقے میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ عصری مسائل سے دور رہتے ہیں اور ادب کے حوالے سے میر و غالب کی دنیا میں مگن لیکن اس کمی کو 21ویں صدی میں ''اردو دنیا'' پورا کر رہا ہے۔ اس رسالے کی ہر اردو خاندان تک رسائی ہونی چاہیے۔ یہ نہ صرف ادب و زبان کی آبیاری میں لگا ہوا ہے بلکہ اردو والوں کو سائنسی، تعلیمی اور عصری ٹکنالوجی سے آگاہ کر رہا ہے۔ زیر نظر شمارے میں تمام مضامین قابل تعریف ہیں۔ بالخصوص مستقل کالم، ''اچھی اردو، روزمرّہ، محاورہ، صرف'' کے علاوہ ''انگریزی پر عربی کا اثر''، ''اعلیٰ تعلیم اور کثیر ثقافتی معاشرہ'' بہت خوب ہیں۔ کتنے پاکستان پر چندر بھان خیال کا مضمون سیر حاصل ہے۔

■ **رضوان خان، 96، شیخ سرائے، سیتاپور-261001**

''اردو دنیا'' بابت اپریل 2007 موصول ہوا۔ زبان اور تعلیم کے گوشے میں شائع تمام مضامین اچھے ہیں۔ بالخصوص جناب محمد سراج الدین کا مضمون ''انگریزی زبان پر عربی کا اثر'' بہت پسند آیا۔ گوشۂ ادب میں جناب ابوبکر عباد کا مضمون ''بنگال نشاۃ ثانیہ اور اردو'' اہمیت کا حامل ہے۔ ''اردو دنیا'' میں ماحولیات سے متعلق مضامین اکثر شائع ہوتے ہیں۔ اس بار بھی دو مضامین ''ماحولیاتی آلودگی اور روشنی'' اور ''جنگلات کا تحفظ'' شائع ہوئے ہیں جو معلوماتی ہیں۔ کیریئر کے حوالے سے شائع ہونے والے مضامین ''ٹیلی ویژن نیوز'' اور ''سماجی وفلاحی کارکن'' ایسے مضامین ہیں جن سے قارئین استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ آج کل ٹیلی ویژن نیوز میں اکثر ایسے نیوز ریڈرس خبریں پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا تلفظ بہت ہی خراب ہوتا ہے اس حوالے سے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر اردو تعلیم سے آراستہ نوجوان اس شعبے میں آنے کی کوشش کریں گے تو وہ کامیاب ہوں گے۔

■ **حفیظ رحمانی، جنرل سکریٹری بزم اردو، سیتاپور۔ یوپی**

''اردو دنیا'' کافی معیاری اور معلوماتی ہوتا جا رہا ہے۔ یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے۔ صحت زبان پر خصوصی توجہ مستقل کالم ''اچھی اردو: روزمرّہ، محاورہ صرف'' از جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی وجہ سے بڑھ رہی ہے اس معیاری اشاعت پر ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

■ **طارق شمسی، 127، پنجابیان کٹرہ شہاب خان، اٹاوہ 206001 (یوپی)**

''اردو دنیا'' بصورت بہتر بقیمت کمتر ایک ممتاز منفرد رسالہ ہے۔ اپنے معیاری مضامین کے ساتھ ساتھ اردو دنیا کی خبروں سے بھی باخبر کرتا ہے۔ خدا اسے نظر بد سے محفوظ رکھے اور ترقیوں سے ہمکنار کرے۔ ایک مشورہ یہ ہے کہ اگر اس میں اردو کے ممتاز ادبا و شعرا کا سوانحی سلسلہ مستقل شروع کر دیا جائے تو اردو طلبہ کے لیے یہ ایک مفید سلسلہ ثابت ہوگا۔ مستقل ''اچھی اردو: روزمرّہ، محاورہ، صرف'' از جناب شمس الرحمٰن فاروقی شروع کرنے پر مبارکباد۔ ''منے میاں کی بکری'' بچوں میں تعلیم کے حصول کی لگن پیدا کرنے کے لیے ایک اچھی کہانی ہے۔ کہانی کار کو مبارکباد۔

■ **ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، فرحت منزل، محلہ کالی پلٹن، ٹونک راجستھان-304001**

''اردو دنیا'' کے مارچ 2007 کے شمارے میں ''زبان اور تعلیم'' کے ذیل میں ''بنیادی تعلیم میں سماجی اشتراک'' کے عنوان سے راج رانی اور رنجنا اروڑا کی انگریزی تحریر کا ترجمہ (مترجم الطاف انجم) شائع ہوا ہے۔ جس میں گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش کے پروجیکٹس کو بطور مثال پیش کیا ہے اور خصوصاً راجستھان کے حوالے سے لوک جنبش کا ذکر کیا ہے آخر میں بی آر سی اور ڈائٹ کے ذریعے اساتذہ کی ٹریننگ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ سماجی اشتراک اور بنیادی تعلیم کا دائرۂ کار بڑا وسیع ہے۔ الطاف انجم نے مضمون کی تلخیص پیش کی ہے جو ایک اشاریے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سماجی اشتراک کے ضمن میں سرو شکشا ابھیان کا ذکر بھی ناگزیر ہے جو پورے ملک میں چل رہا ہے جس کے تحت مختلف طبقوں اور عوامی نمائندوں کی ورک شاپ منعقد کی جاتی ہیں۔ اسکول منیجنگ کمیٹی میں سماج کے مختلف فرقوں کے لوگ رکن ہوتے ہیں۔ عام تعلیمی مہم اور سماجی اشتراک ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ خاص طور پر جن طبقوں کے بچے تعلیم سے محروم ہیں، ان طبقوں کی نشاندہی نہایت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر پسماندہ، غریب اور اقلیتی طبقے کے ان بچوں کو تعلیم سے جوڑنے کی اشد

ضرورت ہے جنھوں نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ یا وہ بچے جو اپاہج ہیں اور وہ بچیاں جن کے والدین انھیں اسکول نہیں بھیجتے۔ ایسی بچیوں کے لیے NPEGL اسکیم کے تحت راجستھان میں ہر تحصیل میں، کستوربا گاندھی رہائشی اسکول قائم کیے جارہے ہیں۔ علاوہ ازیں تعلیم کا معیار سدھارنے کے لیے حال ہی میں راجستھان میں عظیم جی پریم جی فاؤنڈیشن کے تعاون اور حکومت راجستھان کے اشتراک سے "اسکول لرننگ گارنٹی پروگرام" ضلع ٹونک اور سروہی میں شروع کیا گیا ہے۔ راجستھان میں اقلیتی طبقوں میں بنیادی تعلیم کو عام کرنے کے لیے مدرسہ تعلیم کا انتظام ہے۔ سروشکشا ابھیان کی جانب سے بھی اقلیتی طبقوں کے لیے مدرسے قائم کیے گئے ہیں جہاں ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے۔ سماجی اشتراک اور اردو تعلیم کا رشتہ کس طرح قائم کیا جائے؟ یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے۔ سروشکشا ابھیان اور دوسرے پروجیکٹ اقلیتی طبقے کے بچوں اور ان کے والدین کو رغبت دلاتے ہوئے ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کا انتظام کس حد تک کرسکتے ہیں اس پر بھی غور کیا جانا ضروری ہے۔

کسی بھی طبقے یا فرقے میں بنیادی تعلیم عام کرنے کے لیے ہمیں ان کی زبان میں بات کرنی ہوگی۔ تبھی وہ تعلیم کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے، اس کی طرف رجوع ہوسکیں گے۔ اس ضمن میں راجستھان مدرسہ بورڈ بھی بہتر کام کررہا ہے۔ مدرسوں کے ساتھ عوام کو زیادہ سے زیادہ جوڑنے کے لیے عوامی تعلیمی کمیٹیاں ہر ضلع میں بنائی جارہی ہیں۔ بچوں کے لیے اردو اور عربی کی کتابیں تیار کی جارہی ہیں تاکہ مدرسوں کے بچے ہندی انگریزی، سائنس، ریاضی کے ساتھ اردو اور عربی بھی پڑھ سکیں۔ اس عمل سے سماجی اشتراک میں مزید اضافہ ہوسکے گا۔

■ **شاداں سلطان پوری ایم، سیج پبلی کیشنز، بھٹی جرولی، کٹاواں، سلطان پور، یوپی**

ماہنامہ "اردو دنیا" ماہ مارچ 2007 اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ چند تجاویز پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ انھیں عملی جامہ پہنانے پر غور فرمائیں گے۔ ادبی کوئز کا سلسلہ جو پہلے جاری تھا اسے دوبارہ جاری کردیں۔ اس سے ہم طالب علموں کو بہت فائدہ ہورہا تھا۔ ابتدائی درجات سے اعلیٰ تعلیم تک کی نصابی کتب سے تدریسی اشارات بھی شائع کیے جائیں۔

■ **مدحت لقمان، EWS-109/4, ADA کالونی، نیم سرائے، الہ آباد -211011 (یوپی)**

مارچ 2007 کا "اردو دنیا" موصول ہوا۔ بہت ہی منہمک کرلینے والے مضامین ہیں۔ مستقل کالم "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" از جناب شمس الرحمن فاروقی صاحب کے کالم کے بارے میں کچھ کہنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوگا۔ شائق احمد یکتیٰ کا "جرمنی کا سفر" بہت خوب ہے۔ خواجہ اکرام کا "سائبر اسپیس: اور اردو زبان کی تدریس" بہت معلوماتی ہے۔ محمد خلیل مضمون "پلاسٹک" میں Bio Degradable پلاسٹک کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کرتے تو بہتر ہوتا۔ محترمہ آمنہ تحسین کا مضمون "ویمنس اسٹڈیز پروگرام" نہایت معلوماتی اور مفید ہے۔

■ **ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈومن پورہ، کساری، مئوناتھ بھنجن (یوپی)-275101**

ماہنامہ "اردو دنیا" پابندی سے اور بروقت موصول ہوجاتا ہے مارچ 2007 کا شمارہ بھی حسب سابقہ صوری اور معنوی لحاظ سے بہتر اور خوب ہے۔ مع اداریہ جملہ نگارشات مفید اور معلومات افزا ہیں۔ مستقل کالم "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" از جناب شمس الرحمن فاروقی صاحب بہت ہی اہم ہے یہ سلسلہ بہرحال جاری رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ "جدید تعلیم۔ عصری ضرورتیں اور اردو"۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔ "سائبر اسپیس اور اردو زبان کی تدریس"۔ خواجہ اکرام۔ "بنیادی تعلیم میں سماجی اشتراک"۔ راج رانی، رنجنا اروڑا۔ تعلیم سے متعلق اچھے اور کارآمد مضامین ہیں۔ "منیر نیازی۔ غزل کے آئینے میں"۔ شائع کرکے آپ نے مرحوم کو بہتر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ □□□

اعتذار

"اردو دنیا" کے "اپریل" کے شمارے میں کملیشور کے ناول "کتنے پاکستان" پر جناب چندر بھان خیال کا ایک مختصر تعارفی مضمون ہم نے شائع کیا تھا۔ عام طور پر قارئین نے اس مضمون کو کافی پسند کیا لیکن بعض حضرات شاکی ہیں کہ کملیشور نے ایک جگہ جس کا حوالہ مضمون میں آیا ہے، علامہ شبلی نعمانی کا ذکر، جو اپنے زمانے کے راسخ العقیدہ قوم پرست مسلمان تھے ایسے الفاظ میں کیا ہے جو علامہ کے شایان شان نہیں۔ ہم بھی آں جہانی کملیشور کے ریمارک سے اتفاق نہیں رکھتے لیکن اس اقتباس سے چونکہ ان کا نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے، اس لیے اسے حذف کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ جن حضرات کو اس ریمارک سے تکلیف پہنچی، ادارہ ان سے معذرت خواہ ہے۔

□□□

ہماری بات

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی مئی 1857 کے اوائل میں میرٹھ کی فوجی چھاؤنی سے شروع ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئی تھی۔ انگریز حکام اور ان کے ہمنواؤں نے اسے کچھ شوریدہ سر سپاہیوں کی سرکشی قرار دے کر غدر کا نام دیا لیکن یہ بغاوت جس تیزی سے اطراف ملک میں پھیل گئی وہ اس حقیقت کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ اسے زبردست عوامی تائید حاصل تھی اور اسی پر جوش عوامی تائید کا اندازہ کر کے بہت سے علما فوجی سردار اور مقامی حکمراں بھی باغیوں کی ہم نوائی پر کمربستہ ہو گئے۔ انگریزوں کے ظلم و زیادتی اور ان کی غاصبانہ روش کے خلاف دلوں میں اندر ہی اندر جو غصہ پل رہا تھا وہ یکبارگی ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر جنھیں انگریزوں نے اپنا وظیفہ خوار بنا کر لال قلعے کی چاردیواری میں محصور کر دیا تھا، باغیوں کے دلی پہنچنے پر انھوں نے بھی ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی جو کچھ مدد کر سکتے تھے، کی۔ ادھر لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی سربراہی اور مولوی احمد اللہ کی رہنمائی میں غیر ملکی تسلط کو للکارا گیا۔

یہ پہلی جنگ آزادی شکست انجام ہوئی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ مجاہدین منظم نہیں تھے اور اس عدم تنظیم کے نتیجے میں ان کی صفوں میں انتشار تھا، انگریزوں نے اس افراتفری کا فائدہ اٹھایا۔ باغیوں کے پاس ہتھیاروں اور دوسرے سامان جنگ کی بھی کمی تھی، جو ہتھیار تھے وہ بھی پرانی وضع کے تھے۔ انگریز فوجیں منظم بھی تھیں اور اس دور کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس۔ پھر بھی یہ معرکہ یک طرفہ نہیں رہا۔ مجاہدین نے انگریزی فوجوں اور انگریزی مفادات کو زبردست نقصان پہنچایا۔

یوں تو بیرونی غاصبوں کے خلاف 1857 سے پہلے بھی محاذ آرائیاں ہوئی تھیں۔ حیدر علی اور اس کے جانشین سلطان ٹیپو نے وطن دوستی کی شاندار مثالیں قائم کی تھیں اور غیر ملکی غاصبوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ 1857 سے پوری ایک صدی قبل 1757 کی جنگ پلاسی بھی اسی جذبے کا عملی اظہار تھی لیکن 1857 کی بغاوت نے جو چنگاریاں روشن کی تھیں پھر وہ بجھیں نہیں۔ یہ سلگتی رہیں اور اندر ہی اندر سامراج کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی گئیں۔ اسے وقت کی ستم ظریفی کہیے کہ انگریزوں نے اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے ملک میں جو نظام تعلیم رائج کیا اور انگریزی زبان کی تعلیم کو جس طرح عام کیا، اس سے وطنیت اور قومیت کے تصورات کو اور فروغ ملا اور ایک ایسی نسل سامنے آئی جو اپنے حقوق اور قومی تشخص کا زیادہ واضح شعور رکھتی تھی۔

اردو کے اہل قلم نے ملک کی جنگ آزادی میں شروع ہی سے ہراول دستے کا فریضہ انجام دیا۔ راجہ رام نرائن موزوں کا یہ شعر تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جو انھوں نے انگریزوں کے ہاتھوں سراج الدولہ کے قتل کے بعد کہا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مصحفی کا یہ شعر بھی زباں زد ہے:

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

غالب کا وہ غزل نما قطعہ بھی اپنی اثر انگیزی میں بے مثال ہے جس کا پہلا شعر ہے:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا

مولوی محمد باقر (محمد حسین آزاد کے والد) اردو ہی کے صحافی تھے جنھیں انگریزوں نے 1857 کی بغاوت کو ہوا دینے کے 'جرم' میں موت کی سزا دی۔ لیکن ان کی جگہ لینے والے اہل قلم پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اپنی نثری اور شعری نگارشات سے قومی اور وطنی جذبات کی آبیاری کی اور آزادی کی لڑائی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جوش ملیح آبادی کی نظم "وفادارن ازلی کا پیغام، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" نے جنگ آزادی کے آخری مرحلے میں پورے ملک کی فضا کو گرما دیا تھا اور اس کا آخری شعر خاص و عام کی زبان پر تھا:

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

آزادی کی لڑائی میں اردو زبان نے جو کلیدی کردار ادا کیا ہے، قومی اردو کونسل کوشاں ہے کہ اس سے اہل ملک کو زیادہ سے زیادہ واقف کرایا جائے۔ اس سلسلے میں کونسل نے متعدد منصوبے بنائے ہیں، کچھ کتابیں بھی شائع کی جائیں گی۔ سردست 8 تا 10 مئی انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ہندی، آگرہ کے اشتراک سے ایک سہ روزہ سیمینار بہ عنوان "1857 کی نشاۃ ثانیہ اور ہندوستانی زبانیں" منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس سیمینار میں ملک کے طول و عرض سے ممتاز مورخین، ماہرین سماجیات، ماہرین سیاسیات کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے جن میں سے چند کے اسمائے گرامی ہیں: پروفیسر عرفان حبیب، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر اقبال حسین، پروفیسر اقتدار عالم خاں، پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شاہد امین، جناب اسد زیدی اور پروفیسر امتیاز احمد۔ سیمینار میں پڑھے جانے والے مضامین چھاپے بھی جائیں گے۔

ادارہ

□□□

مخمور سعیدی

ڈاکٹر علی جاوید — اجمالی تعارف

ڈاکٹر علی جاوید، جنھوں نے 3 اپریل 2007 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے، ایک فعال اور سرگرم شخصیت کے مالک ہیں اور اپنی علم دوستی اور ادبی، ثقافتی، تہذیبی امور سے اپنی گہری دلچسپی کے لیے پوری اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر علی جاوید نے جن کا آبائی وطن الہ آباد ہے، گریجویشن الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ 1983 میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی (J.N.U.) سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اس سے پہلے انھوں نے جعفر زٹلی پر (1977-79 میں) ایم فل کا مقالہ تحریر کیا تھا اور زٹلی کو اردو کا پہلا باغی شاعر قرار دیا تھا، جس نے ماحول میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو طنز و تمسخر کا ہدف بنایا۔ 2000 میں اسی موضوع پر ان کی کتاب ''جعفر زٹلی کی احتجاجی شاعری'' شائع ہوئی اور اسی سال ان کے مضامین کا مجموعہ بھی ''افہام و تفہیم'' کے نام سے چھپا۔ اس سے پہلے ان کی ایک کتاب ''کلاسیکیت اور رومانیت'' 1999 میں چھپ چکی تھی۔ 1992 میں ان کی ایک کتاب ''برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو'' شائع ہوئی تھی۔ یہ چاروں کتابیں علمی حلقوں میں پسند کی گئیں۔

ڈاکٹر علی جاوید J.N.U. میں طالب علم بھی رہے اور وہاں تدریسی فرائض بھی انجام دیے 1977-79 کے درمیانی عرصے میں انھوں نے غیر ملکی طلبہ اور سرٹیفکیٹ کورس کے طلبہ کو اردو پڑھائی۔ پی ایچ ڈی مکمل کر لینے کے بعد انھوں نے 1993 سے 1998 تک ذاکر حسین کالج میں استاد کے فرائض انجام دیے اور پھر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر علی جاوید ہندی اور انگریزی بھی اردو ہی کی طرح روانی سے لکھ، پڑھ اور بول سکتے ہیں اور فارسی بھی سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی ذہنی اور عملی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ وہ پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ دوردرشن کے لیے اردو غزل پر ایک دستاویزی فلم میں چیف پروڈکشن اسسٹنٹ کی ذمہ داری نبھانے کے علاوہ وہ دوردرشن میٹرو چینل کے لیے 26 ایپی سوڈ پر مشتمل سیریل ''کشمکش'' میں ڈائلاگ اور اسکرپٹ سپروائزر بھی رہے اور سعید اختر مرزا کی ایک فیچر فلم کے لیے ریسرچ ورک بھی کیا۔

ڈاکٹر علی جاوید، ذاکر حسین کالج (شبینہ) کے جریدے ''شمع حیات'' کے نگراں، اور Youth life & Yuva Vedi پندرہ روزہ کے جو انگریزی اور ہندی دو زبانوں میں نکلتا تھا، ایڈیٹر رہے۔ ان کی ادارت میں سہ ماہی اردو جریدہ ''اقدار'' بھی نکلتا رہا ہے۔ 1993 میں انھوں نے U.G.C. سے "Impact of Delhi College on the Cultural life of 19th Century" کے عنوان پر اپنے تحقیقی کام پر ایوارڈ حاصل کیا اور 1997 میں ہریانہ اردو اکادمی نے بھی انھیں ایوارڈ پیش کیا۔ وہ دہلی کی کئی علمی، ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے سرگرم ممبر اور عہدیدار رہے ہیں جن کی تعداد پندرہ ہے۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک بھی متعدد سیمیناروں میں اردو کی نمائندگی کی ہے۔ 11، 12 اور 13 اپریل 2006 کو قاہرہ میں ہونے والی ایفرو ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن کی کانفرنس میں انھوں نے مقالہ بھی پڑھا اور ایک سیشن کی صدارت بھی کی۔

ڈاکٹر علی جاوید کے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالتے پر اردو والوں میں مسرت اور اطمینان کی جو لہر دوڑ گئی ہے وہ ان خوش آئند توقعات کا اظہار ہے، جو اردو کے تمام حلقوں نے ان کی فعال شخصیت سے وابستہ کی ہیں۔

□□□

■ **ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)**
اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110001

میں علی جاوید صاحب کی شخصیت سے ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔ وہ اردو کے ایک فعال اور سرگرم کارکن ہیں۔ انھوں نے اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔

مجھے دلی مسرت ہے کہ جاوید صاحب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر منتخب ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی سربراہی میں کونسل ترقی اور فروغ کے راستے پر گامزن ہوگی۔

میں ایک بار پھر جاوید صاحب کے تقرر پر انھیں اور اہل اردو کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

■ **پروفیسر علی رفاد فتیحی، صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ-202002**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قومی اردو کونسل آپ کی رہنمائی میں ہمہ جہت ترقی کرے گی۔ ہمارا ڈپارٹمنٹ آپ کے اور کونسل کے ساتھ مکمل تعاون کی پیشکش کرتا ہے۔

■ **[illegible] دہلوی، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو، دہلی**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے پر میری جانب سے بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ اپنی علم دوستی اور ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کے سبب آپ علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ امید قوی ہے کہ آپ کی سربراہی میں اردو کونسل ترقی کی نئی منزلیں طے کرے گی اور آپ کے عہد میں کونسل کے ذریعے اردو کو خاطر خواہ فروغ ہوگا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

اس کالم میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔ ادارہ

سوال: دار اور وار کے استعمال کی وضاحت کیجیے مثلاً نمبردار، ٹھیکیدار، دلدار، سلسلہ وار، نمبر وار آیئے، دل وار دیا؟

جواب: آپ نے تین طرح کے لفظوں کے بارے میں الگ الگ سوال کرنے کے بجائے ایک ہی سوال کردیا۔ بہرحال، جواب ملاحظہ ہو:

''نمبردار''، ''دلدار'' وغیرہ میں ''دار'' اسم فاعل ہے، اس کا مصدر ''داشتن'' ہے، بمعنی ''رکھنا''۔ لہٰذا یہاں ''دار'' کے معنی ہیں ''رکھنے والا''۔ لہٰذا ''نمبردار'' وہ شخص ہوا جو کسی جگہ (عام طور پر گاؤں میں) کوئی ''نمبر'' (بمعنی درجہ، عہدہ) رکھتا ہو۔ ان معنی میں ''لمبردار'' بھی صحیح ہے۔ ''دلدار'' کے معنی ہوئے ''وہ شخص جو دل [اپنے پاس] رکھتا ہو، یعنی معشوق، یا مہربان دوست''۔ اسی پر اور لفظوں کو قیاس کرلیجیے۔

''وار'' دراصل ''بار'' ہے، یعنی ''باری، کسی چیز یا بات کے واقع ہونے کا صحیح موقع''۔ لہٰذا ''نمبروار'' کے معنی ہوئے ''اپنے نمبر سے، اپنی باری پر'' اور ''سلسلہ وار'' کے معنی ہوئے ''ایک سلسلے میں، یعنی تسلسل سے، ایک کے بعد ایک''۔ ''وارنا'' اردو مصدر ہے، بمعنی ''داؤ پر لگانا، ہار جانا''، وغیرہ۔ اب ''دل وار دیا'' کے معنی خود بخود ظاہر ہو گئے۔

سوال: محراب کے معنی اور مصدر بتایئے؟

جواب: ''محراب'' عربی لفظ ہے، اس کا مادہ ح۔ ر۔ ب۔ ہے، جس کے معنی ہیں ''جنگ''۔ اس طرح ''محراب'' کے معنی ہوئے ''آلۂ جنگ'' یعنی ہتھیار وغیرہ۔

اردو میں اس کے معنی حسب ذیل ہیں: (1) کمان یا نیم دائرہ جیسی تعمیری شکل جس پر دیوار اور پھر چھت کو قائم کرتے ہیں۔ ان معنی میں اردو کا زیادہ مقبول لفظ ''ڈاٹ'' ہے۔ (2) مسجد کا وہ حصہ جہاں امام نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ جگہ شیطان کے خلاف ایک ہتھیار ہے، لہٰذا اسے ''محراب'' کہتے ہیں۔ (3) کسی عمارت کا صدر دروازہ۔ یہ آخری معنی اردو میں شاذ ہیں۔

میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ سوالات اردو زبان کے متعلق ہوں اور ایک وقت میں تین سے زیادہ سوال نہ پوچھے جائیں۔ لیکن جب سوالات آ جاتے ہیں تو جواب نہ دینا کج خلقی معلوم ہوتی ہے۔ سوال کنندہ صاحبان براہ کرم خیال رکھیں کہ اس کالم کا عنوان ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' ہے۔

(سوالات از واجد حسین صدیقی، علی گڑھ)

سوال: رسالہ اور جریدہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: آج کل یہ دونوں لفظ اس اعتبار سے ہم معنی ہیں کہ دونوں سے ہم ایسا اخبار یا کتاب مراد لیتے ہیں جس میں مختلف اصناف پر مبنی تحریریں ہوں اور جو کسی مقررہ وقفے سے نکلتا ہو۔ ''جریدہ'' اب ذرا کم سنائی دیتا ہے۔ ''رسالہ'' کے اور بھی معنی ہیں، مثلاً (1) فوجیوں کا دستہ، (2) کوئی مختصر کتاب جو ایک ہی موضوع پر ہو۔ ''جریدہ'' کے اصل معنی ''تنہا'' ہیں۔ چونکہ رسالہ یا اخبار کا بھی ایک ایک شمارہ مقررہ وقت پر نکلتا ہے اس لیے ''رسالہ، اخبار'' کے معنی بھی پیدا ہو گئے۔ ''جریدہ'' بمعنی ''تنہا'' اب بہت کم سننے میں آتا ہے۔ ''صحیفہ'' کے معنی میں، اور ''فوجی دستہ'' کے معنی میں بھی ''جریدہ'' پہلے بولا جاتا تھا۔ اب ''جریدۂ عالم'' کی ترکیب (غالباً حافظ کے ایک شعر کی وجہ سے) ہی مستعمل نظر آتی ہے۔ اکیلے ''جریدہ'' بمعنی ''صحیفہ'' شاذ ہے، اور

بمعنی "فوجہ دستہ" بالکل مستعمل نہیں۔

سوال: الف اور ہمزہ کیا دونوں ایک ہی ہیں؟

جواب: اردو کے لیے الف اور ہمزہ الگ الگ حرف ہیں۔ اکثر اوقات (خاص کر وسط لفظ میں) ہمزہ وہی کام کرتا ہے جو ہم الف سے بھی لے سکتے تھے، (مثلاً لائیے، سئیس، وغیرہ کو لا ایے اور س ایس لکھ سکتے ہیں)۔ لیکن اردو نے الف کی جگہ ہمزہ اختیار کیا کیونکہ اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ عربی میں ہمزہ اور الف ایک ہی چیز ہیں۔ عربی میں الف کو ہمیشہ ساکن فرض کرتے ہیں اور عربی میں ابتدا بسکون محال ہے، لہٰذا جن الفاظ کے شروع میں الف ہے ان میں الف کو ہمزہ فرض کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی الف پر ہمزہ لکھ بھی دیتے ہیں۔ عربی کے جن الفاظ میں وسط لفظ میں ہمزہ ہے، مثلاً "جرأت"، ان میں بھی عربی والے الف کو بے وجود مانتے ہیں اور صرف ہمزہ پڑھتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان سب باریکیوں کے باوجود عربی میں ہمزہ کوئی حرف نہیں، حرف تو الف ہی ہے۔ جب الف متحرک ہو جائے تو عربی والے اسے ہمزہ کہتے ہیں۔

سوال: جزولاینفک کا صحیح تلفظ کیا ہے؟

جواب: ج پر پیش، ز ساکن، و پر زبر، لا، ی پر زبر، ن ساکن، ف پر زبر، ک ساکن۔ گویا "جزؤ" کا تلفظ وہی ہے جو "جرم" کا ہے۔ یہاں واؤ پر زبر پڑھیں گے۔ "لاینفک" کا تلفظ وہی ہے جو "لا یخل" کا ہے۔

(سوالات از رفعت جمیل انصاری، کتراس گڑھ، جھارکھنڈ)

سوال: "لغت" مذکر اور "ڈکشنری" مونث کیوں ہے، جب کہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں؟

جواب: "ڈکشنری" کے معنی میں بہت سے لوگ "لغت" کو مونث کہتے ہیں۔ صرف "لفظ" کے معنی میں "لغت" متفقہ طور پر مذکر ہے۔ "ڈکشنری" کو مونث کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے آخر میں چھوٹی ی ہے، اور اردو میں چھوٹی ی پر ختم ہونے والے الفاظ زیادہ تر مونث ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ جب "لغت" کو مونث بھی بولا جاتا ہے تو اسی بنا پر "ڈکشنری" کو بھی مونث بنا لیا گیا۔ تیسری بات یہ کہ "ڈکشنری" کا مرادف ایک اردو لفظ "فرہنگ" بھی ہے جو متفقہ طور پر مونث ہے۔ لہٰذا "ڈکشنری" کو بھی مونث مان لیا گیا۔

سوال: "گزشتہ" صحیح ہے یا "گذشتہ"؟

جواب: اب دونوں ہی کو صحیح مان لینا چاہیے کیونکہ دونوں املا یکساں مستعمل ہیں۔ ویسے، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ "گزشتہ" مع ز کو جن اسباب کی بنا پر درست سمجھ لیا گیا ہے وہ غلط ہیں اور میں "گذشتہ" میں ذ کو ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن رواج عام دونوں کو صحیح کہتا ہے۔

سوال: "سحرالبیان" کہنا چاہیے یا "سحر البیان"؟ اسی طرح "محمد" یا "موحمد"؟

جواب: آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے جو املے لکھے ہیں وہ ہندی میں رائج ہوں تو ہوں، اردو میں تو "سحرالبیان" اور "محمد" ہی لکھا جائے گا۔ ہندی میں "سحرالبیان" کو صحیح لکھنا غیر ممکن ہے۔ یا تو پہلے حرف کو چھوٹی ای کی ماترا دے کر لکھیے، یا اے کی ماترا دے کر لکھیے، دونوں ہی غلط ہوں گے۔ رہا سوال "محمد" کا، تو ہندی میں حرف اول کو چھوٹے او کی ماترا کے ساتھ لکھ سکتے ہیں اور ایسا ہی لکھنا بھی چاہیے۔

(سوالات از نجے کمار، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی)

□□□

پتہ:
29-C, Hastings Road
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

"اردو دنیا" کے قارئین میں اس کالم کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ حال ہی میں بعض سوالات ایسے ارسال کیے گئے ہیں جن کا تعلق محض عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اور ان کے معانی سے ہے۔ اگرچہ ان سبھی سوالات کے جوابات محترم شمس الرحمن فاروقی صاحب کی جانب سے دیے جارہے ہیں لیکن آئندہ سوالات کرتے وقت یہ خیال رہے کہ ارسال کردہ جملہ سوالات کا تعلق صرف اردو زبان اور اس کے روز مرہ سے ہو۔

سوالات ارسال کرنے والے حضرات اپنے نام کے ساتھ مکمل پتہ بھی ارسال کریں۔

ادارہ

سالکہ خاتون صدیقی

املا اور تلفظ کے کچھ مسائل

یہ معروضہ اردو ہجے کے سلسلے میں کچھ ہدایات حاصل کرنے کی غرض سے گوشِ خدمت ہے۔ پہلے میں بزرگوں سے معافی کی درخواست کروں گی کیونکہ ع مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات والا مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے بزرگ پروفیسروں اور علما کو یہ گستاخی شاق گزرے۔ سچ بھی یہ ہے کہ:

ہو قلزم عمّاں پہ لب جو تبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

تاہم یہ پریشانی بھی لاینحل سی ہے۔

مسئلہ ہے واو اور ی یے پر ہمزہ لگانے کا۔ جناب گوپی چند نارنگ اور جناب خلیل صاحب نے ہجے کے اصولوں کو مصوّتے اور مصمتے کے اصول یعنی لسانی منطق اور استقرائی میزان کے دلائل سے سمجھایا ہے جو مناسب ہے مگر ہماری دقت یہ کہ پرائمری کلاس کا بچہ مصوّتے اور مصمتے کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ صرف زبان سے کہہ کر کان سے سنتا اور آنکھ سے دیکھ کر سمجھ سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو خود ٹیچر بھی اس سے نابلد ملیں گے۔ بات تھی یے اور ہمزہ کی، جناب رشید حسن خاں صاحب کا فرمان اس ذیل میں یہ ہے:

''کیجیے، دیجیے لیجیے وغیرہ فعلِ امر کی تعظیمی صورتیں ہیں۔ ایسے افعال کے آخر میں دو ی ہوتی ہیں۔ (د ی ج یے) ان میں پہلی ی کی جگہ ہمزہ لکھنا غلط ہوگا۔'' آگے فرماتے ہیں۔ ''ایسے ہی کچھ فعل وہ ہیں جن میں آخر میں دو یاؤں سے پہلے کسی اور حرف کی بجائے ہمزہ ہے جیسے: جائیے (ج ا ء ی ے) ان کو بھی اسی طرح لکھا جائے گا کہ آخر میں دو ی ہوں گی دیجیے میں تیسرا حرف ج ہے اسی طرح جائیے میں تیسرا حرف ہمزہ ہے آخر کے دونوں حرف اپنی جگہ پر محفوظ ہیں۔

لائیے (ل ا ء ی یے) لائیو۔ پائیے (پ ا ء ی یے) پائیو...... اس کا اصول یہ ہے کہ جن مصدروں میں علامت مصدر ''نا'' سے پہلے الف یا واو ہوتا ہے (جیسے جانا اور رونا) جب ان سے بعض فعل بنتے ہیں تو ان میں ''ئے'' آتا ہے جیسے جائے لائے پائے روئے دھوئے کھوئے۔ ان مصدروں سے جب امر تعظیمی بنیں گے تو اس آخری ی کے آگے ایک یے اور بڑھا دی جائے گی علامت کے طور پر جیسے لائے سے لائیے (ل ا ء ی یے) پائے سے پائیے۔ کھوئے سے کھوئیے وغیرہ۔ جن مصدروں میں ''نا'' سے پہلے الف یا واو کے بجائے کوئی اور حرف ہو ان سے جب فعل امر بنتے ہیں تو ان کے آخر میں صرف ایک یے ہوتی ہے جیسے چلنا سے چلے اور بنا سے بنے اور کرنا سے کرے ان سے جب تعظیمی فعل بنیں گے تو اس یے کے آگے ایک اور یے (علامت کے طور پر) بڑھائی جائے گی۔ جیسے کرے سے کریے، بنے سے بنیے سنے سے سنیے وغیرہ اسی طرح جن لفظوں کے آخر میں یے ساکن ہوتی ہے (اور اس سے پہلے الف یا واو ہوتا ہے) تو اس پر بھی ہمزہ نہیں آسکتا ہے جیسے گاے اگر اس کو گائے لکھا جائے گا تو لفظ ہی بدل جائے گا اور اب یہ گانا مصدر کا ایک فعل ہوگا جیسے اس سے کہو کہ وہ گانا گائے۔ ایسے لفظ راے، گاے، ہاے، چاے، واے، براے، سواے، بجاے، سہاے، سراے، وائسراے، آہناے اپاے...... ایسے لفظوں کے لکھنے میں یہ غلطی اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ یے پر ہمزہ کو بھی مسلط کر دیا جاتا ہے اور اس سے املا چوپٹ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''چاے'' تین حرفی لفظ ہے جس کے آخر میں یے ہے اور اس سے پہلے الف ہے اگر اس کو چائے لکھا جائے تو یہ چار حرفی لفظ ہو جائے گا اور الف اور یے کے بیچ میں ایک اور حرف (ہمزہ) آبراجے گا۔ جبکہ اس کے لیے گنجائش ہی نہیں۔ تین حرفی لفظ چار حرفی بن جائے گا۔ اس سے لفظ بھی بگڑے گا اور املا بھی۔''

(اردو کیسے لکھیں (صحیح املا) ص-72 تا ص-75، مصنفہ رشید حسن خاں)۔

''املا نامہ'' مصنفہ گوپی چند نارنگ میں بھی یہی اصول درج ہیں یہ تفصیل سے ہیں اور وہاں اجمالاً۔

اس پورے تذکرے کو پڑھنے کے بعد میرے معروضات پر تمام اہلِ قلم اور صاحب علم و دانش غور فرمائیں یعنی ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

چائے ہو یا گائے (جانور) دونوں لفظوں کا تلفظ روزمرہ میں وہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔

اگر ہم بلیک بورڈ پر لکھتے ہیں اور ساتھ ہی زبانی تلفظ بھی دہرواتے جاتے ہیں یعنی ہم بچوں سے کہتے اور کہلواتے ہیں گ+ا (گاف الف زبر) گا (ہمزہ یے زیرے)= گائے۔

اگر اس پر ہمزہ نہیں لکھتے اور تلفظ وہی کرتے ہیں جو گائے کا ہے تو بچے کو ہم کیا کہہ کر سمجھائیں کہ یہ آواز کس حرف کی ہے (آپ کہیے گ زبر گ اور الف ے زیر اے) تو اسے گئے تو کہا جاسکتا ہے گائے نہیں۔ یا (گ۔ الف زبر گا، یے ساکن) تو بھی اس کا تلفظ گائے نہیں ہوسکتا۔

اگر یہ اور اس قبیل کے دیگر الفاظ تین حرفی سے چار حرفی ہوجاتے ہیں تو کیا نقصان واقع ہوگا؟ یہ الفاظ نہ کسی آسمانی کتاب کے ہیں کہ اہانت یا اختراع کا تصور ہو نہ اس سے زبان کے کسی مروجہ اصول پر ضرب کاری لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ سے ہمزہ سے لکھے جاتے رہے ہیں اب پتہ نہیں کیوں ہمزہ ہٹایا گیا۔ اس ضمن میں سند کے لیے سب سے مستند نام اسمٰعیل میرٹھی کا ہے۔

اگر گائے (گانا کا مشتق) اور گائے (چوپایہ) ایک ہی ترکیب سے لکھے جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ صدہا الفاظ اردو میں بھی اور ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ آخر سونا (دھات) اور سونا (فعل نیند لینا) بھی تو ترکیبی طور پر ایک ہیں۔ طور سینا اور کپڑے سینا میں لفظ سینا کی بھی ترکیبی صورت یکساں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

زبان کے اصول اتنے سخت نہیں ہوسکتے جو روزمرہ کے حالات اور ضرورت زبان کے مخالف ہوں۔

آسمانی فتاوے بھی اجتہاد سے ضرورت کے مطابق کم وبیش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تو معمولی ضرورت کے اصول ہیں۔ میرا معروضہ یہ ہے: بچوں کو ہجے سکھانے کے لیے ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ حرف کی جو آواز اعلانیہ منہ سے نکلتی ہے اس کو وہی بتائیں۔ صرف عربی کے چند اصولوں کو چھوڑ کر۔ جناب رشید حسن خاں صاحب نے اللہ کا مسئلہ حل کر دیا اور کہہ دیا اللہ نہ لکھ کر ''للہ'' لکھ دیا جائے اور پہلے لام پر زیر بھی لگا دیا جائے اس سے اشتباہ ختم ہوجائے گا (اردو کیسے لکھیں ص-30) اللہ اسی طرح اس ہمزہ کے مسئلے کو بھی حل فرمادیجیے۔ کیونکہ بچوں کو قواعد کے ثقیل اور لسانیات کے منطقی اصول نہیں پڑھائے جاسکتے۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ اس وقت ان کی سمجھ کے مطابق غلط سلط پڑھا دیں پھر بڑے ہوکر وہ ہمیں جاہل کہہ کر یاد کریں۔

خلاصہ یہ کہ ہمزہ کا یہ مسئلہ محض فرضی ہے املا اور الفاظ کی ترکیبی شکل وہی ہونی چاہیے جو آواز منہ سے نکلتی ہے اور کانوں کو سنائی دیتی ہے جو تلفظ عوام (خواندہ لوگوں) میں بھی رائج ہے اور جائز قرار دیا گیا ہے اسی کو ضبطِ تحریر میں بھی لایا جائے۔ یہ کیا کہ بولیں کچھ اور لکھیں کچھ۔ انگریزی کی سی بے راہ روی۔ چنانچہ واو ہو یا یے جہاں چار حرفی آواز اعلانیہ ہے وہاں ہمزہ لگانا ہوگا اور ہم (مدرس، ٹیچر) گاے راے نہیں بلکہ انھیں چاہئے گائے رائے ہی پڑھائیں گے اور وہی لکھوائیں گے۔ کیونکہ ہم مجبور ہیں۔ معصوم ذہنوں پر ان کی بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتے۔ رہے تعظیمی الفاظ دیجیے لیجیے وہ یوں ہی صحیح جیسا حکم۔ کیونکہ ان میں ہمزہ کی واضح آواز ہے بھی نہیں۔

دوسرا مسئلہ ہے۔ اگر تین حروف مسکون لگاتار ایک لفظ میں یکجا ہوجائیں تو اس کی ہجے کیا ہوگی۔ مثلاً دوست و گوشت میں و۔س، اور ت تینوں ہی مسکون ہیں۔ مجھے یاد نہیں کب اور کس نے اس کی ہجے مجھے بتائی ہوگی۔ جو میرے ذہن میں یوں محفوظ ہے۔

دُ+و=دو

س۔ مذکور=دُوس

ت۔ ساکن=دوست

اس کی سند میں نے عربی فارسی اصول میں تلاش کی مگر نہیں ملی۔ ایک دو عربی ماہرین نے بھی اس ترکیب سے انکار کیا کہ اس کی مثال عربی میں نہیں ہے۔ آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔ □□□

پتہ:
Primary Urdu Teacher
Mohalla Qazipara,
Jama Masjid Markazwali Bijnor
Distt. Bijnor - 246701 (U.P.)

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا جواب:

عزیزہ محترمہ سلام علیکم۔

آپ کا مضمون یا مراسلہ مجھے ابھی کچھ دن ہوئے ملا کیونکہ میں شہر کے باہر تھا۔ زبان کے تئیں آپ کی دلچسپی قابل داد ہے اور جو سوالات آپ نے اٹھائے ہیں وہ غور وفکر اور تفصیلی جواب کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس وقت مجملاً عرض کرتا ہوں کہ میں املا اور رسم الخط کے بارے میں رواج عام کا قائل ہوں، منطقی موشگافیوں کا نہیں۔ شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ زبان میں قیاس نہیں چلتا اور میں اسی پر سختی سے قائم ہوں۔ ''گائے'' [چوپایہ] اور ''گائے'' [''گانے'' کا ماضی یا مضارع] دونوں ہی ہمیشہ مع ہمزہ لکھے جاتے رہے ہیں۔ اب اس میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کرنا، خواہ کتنی ہی منطقی کیوں نہ ہو، فضول اور نقصان دہ ہے۔ اسی طرح، میں اردو میں مصمتوں، مصوتوں وغیرہ کے تصور کو زیادہ اہم نہیں سمجھتا۔ حرف ''واؤ'' یا ''ے'' کہیں پر مصوتہ کہا جائے اور کہیں پر مصمتہ، تو مجھے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ مجھے تو اردو زبان کی بنیاد ''حرف''

پر قائم نظر آتی ہے، مصوتوں اور مصمتوں پر نہیں۔ ہمزہ، مصوتہ ہے کہ مصمتہ، کہ حرف ہی نہیں ہے؟ یہ باتیں اردو کے لیے بے معنی ہیں۔ اردو نے ہمزہ کو عربی فارسی (خاص کر عربی) سے اکثر بالکل مختلف طور پر استعمال کیا ہے۔ اور ہمزہ کے لیے نئے تفاعلات (Functions) کی دریافت اردو رسم الخط اور املا کی شانوں میں سے ایک شان ہے۔ اور ہمزہ ایک خاص انداز میں ہمارے یہاں مدت سے رائج ہے۔ بہت جگہ ہم عربی والا ہمزہ بالکل ہی نہیں استعمال کرتے، ورنہ ہم ''دعا'' [جس کے آخر میں عربی میں ہمزہ ہے] کو بے ہمزہ کیوں لکھتے اور اسے ''پیدا'' کے ساتھ قافیہ کیوں کرتے؟ عربی میں ''تأثر/موثر'' وغیرہ مع ہمزہ لکھے جاتے ہیں، جس طرح میں نے ابھی لکھا ہے۔ لیکن اردو میں یہ، اور ان کی طرح بہت سے الفاظ بے ہمزہ لکھے جاتے ہیں (تاثر/موثر)۔ تو بس اردو کے لیے یہی درست ہے۔

''کیجئے/لیجئے/کئے/لئے'' وغیرہ میں بہت سے لوگ ہمزہ کی جگہ چھوٹی ی لگاتے ہیں (کیجیے/لیجیے/کیے/لیے)۔ یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ بہت سے لوگوں کا عمل ہے، اور وہ بھی درست ہے جس طرح میں نے اولاً لکھا ہے (کیجئے، وغیرہ)۔ کچھ لوگ کیجیے/لیجیے بھی لکھتے ہیں۔ میں اس کو نامناسب سمجھتا ہوں لیکن یہ عمل بھی بہت سے لوگوں کا ہے، اس لیے میں اسے غلط نہیں کہتا۔ خیال رہے کہ شرط رواج اور عمل جمہور کی ہے۔ اسی وجہ سے میں ''گیے'' (''گیا'' کی جمع) کو غلط سمجھتا ہوں کہ یہ عمل جمہور کے خلاف ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اس طرح تو انتشار پیدا ہوگا۔ کئی زبانوں میں بہت سے لفظوں کے ایک سے زیادہ املا رائج ہیں اور کسی کو انتشار کی شکایت نہیں۔

''برائے خدا'' کے معنی میں ہمارا مروج املا صرف ''للہ'' ہے، ''ماہرین'' کچھ بھی کہیں۔ ان کے لحاظ سے تو ''اللہ'' بھی غلط املا ہے۔ رواج عام اور عمل جمہور کو کتاب کی پروا نہیں ہوتی۔ عمل جمہور کے حساب سے دو لام کے ساتھ ''لللہ'' صحیح نہیں، چاہے اسے آپ جس طرح بھی بنا کر لکھیں۔ میں تو اسم ذات پاک کو ''اللہ'' اور ''اللہ کے واسطے'' کے معنی میں ''للہ'' لکھتا اور انھیں کو درست سمجھتا ہوں۔

رہا معاملہ ''گوشت/دوست/پوست'' وغیرہ قسم کے الفاظ کے تلفظ کا، تو بول چال میں ان کا تلفظ تو اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح وہ لکھے جاتے ہیں، یعنی چاروں حرف صاف صاف بولے جاتے ہیں۔ صرف عروض میں یہ آسانی ہے کہ تین ساکن یکجا ہوں تو ایک (بالعموم آخری) کو ساقط سمجھ لیا جاتا ہے۔ مندرجۂ ذیل مثالوں پر غور کیجئے۔

ہوگیا گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا (غالب)

یہاں ''گوشت'' کی جگہ صرف ''گوش'' فرض کیا جاتا ہے اور پڑھنے میں بھی ت کو یا تو بہت ہلکا پڑھتے ہیں یا پڑھتے ہی نہیں۔ دوسرا مصرع

تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا (غالب)

یہاں بھی ''دوست'' کی جگہ ''دوس'' فرض کیا جاتا ہے اور پڑھنے میں بھی ت کو یا تو بہت ہلکا پڑھتے ہیں یا پڑھتے ہی نہیں۔ تیسرا مصرع

پوست کھینچے اژدہے کا باندھ لائے دیو کو (امداد علی بحر)

یہاں بھی ''پوست'' کی جگہ ''پوس'' فرض کیا جاتا ہے اور پڑھنے میں بھی ت کو یا تو بہت ہلکا پڑھتے ہیں یا پڑھتے ہی نہیں۔

کچھ اور مثالیں

اب کارداے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک (میر)

''کارد'' میں الف، ر، د، تینوں ساکن ہیں۔ لہٰذا دکو نا موجود فرض کرتے ہیں۔ ورنہ مصرع یوں بھی موزوں تھا

اب کارائے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

اگر یہ کہا جائے کہ میر کے زیر بحث مصرعے میں دال اور الف مل گئے ہیں اور الف موصولہ کی صورت پیدا ہوگئی ہے تو مصرع یوں پڑھئے:

اب کادائے عزیزاں پہنچی ہے استخواں تک

دونوں صورتوں میں ایک ساکن حرف کے ساقط ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح، اکبرالٰہ آبادی کا یہ مصرع دیکھئے

اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

یہاں بھی ''پارک'' کو ''پار'' پڑھیں، یا ''پاک'' پڑھیں، مصرع بہرصورت موزوں رہتا ہے۔ لہٰذا اصول یہ ہے کہ جب تین ساکن جمع ہوں تو ایک ساکن کو ساقط یا غیر موجود قرار دیتے ہیں۔ عموماً آخری ہی ساکن کو ساقط سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت تینوں میں سے کوئی بھی ایک ساقط قرار دیا جائے تو بھی مصرعے میں خلل نہیں پڑتا۔ لیکن خیال رہے کہ یہ صرف عروضی بات ہے، عام بول چال میں اور نثر میں ہمیشہ تینوں ساکن ادا کئے جائیں گے، چاہے تینوں کو برابر وضاحت سے نہ ادا کیا جائے۔ لہٰذا ہجے کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔ بچوں کو بتایا جائے کہ (مثلاً) دوست میں آخری تینوں حرف ساکن ہیں اور س ت کو موقوف کہا جائے گا۔ عربی میں چونکہ ہر آخری حرف پر کوئی نہ کوئی حرکت ضرور فرض کی جاتی ہے لہٰذا وہاں کوئی مسئلہ نہیں۔

امید ہے اب آپ کو دونوں سوالات کے شافی جواب مل گئے ہوں گے۔

□□□

کلیم ضیا

اردو زبان کی تعلیم اور علاقائی زبانیں

زبانیں جنمتی ہیں بولنے سے، پنپتی ہیں برتنے سے، فروغ و ارتقا کے منازل طے کرتی ہیں اپنے چاہنے والوں اور جان نچھاور کرنے والوں کی سعی بلیغ سے، دیگر زبانوں کے برتنے والوں کے دلوں میں گھر کرتی ہیں اپنی مقبولیت وسائل زندگی کے حصول اور سرکاری سرپرستی کی بدولت یہ سچائی دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان اور اس کے درس وتدریس پر بھی صادق آتی ہے۔

ریاست مہاراشٹر میں ریاستی زبان یعنی مراٹھی کے ساتھ ساتھ دیگر اقلیتی زبانوں کے نہ صرف حقوق محفوظ ہیں بلکہ ان کی تبلیغ و اشاعت کے مواقع قدم قدم پر دستیاب ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں بہار کے بعد اردو کی اشاعت اور فروغ و ارتقا کا سب سے بڑا مرکز ریاست مہاراشٹر ہے۔ مہاراشٹر کے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک دیہات سے گاؤں تک اور تعلقے سے ضلع تک غرض کہ ریاست کے کونے کونے میں اردو اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔

2001 کی مردم شماری پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اس وقت ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان اور اس کی درس وتدریس کن مراحل سے گزر رہی ہے۔ ریاست مہاراشٹر کی کل آبادی 9 کروڑ، 27 لاکھ، 78 ہزار 6 سو 27 (9,68,78,627) ہے۔ اس میں مسلمانوں کی آبادی 10 کروڑ، 27 لاکھ 4 سو 85 (10,27,485) ہے۔ ایک اندازے کے مطابق مہاراشٹر میں مسلمانوں کی کل آبادی کا تقریباً 80% تا 85% حصہ اردو زبان سے مربوط و منسلک ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد برادران وطن نے اردو کو یکسر نظرانداز کر دیا اور آج وہی رویہ اہل اردو کا اردو زبان کے ساتھ ہے۔ مسلمان، ریاست کی کل آبادی کا 10.6% ہیں۔ ریاست کا عام تعلیم یافتہ حصہ 66.2% اور مسلمانوں میں تعلیم یافتہ مرد 77.1% اور عورتیں 70.8% ہیں۔ پرائمری اردو اسکولوں کی تعداد 2,846 ہے جب کہ ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد تقریباً ساڑھے آٹھ لاکھ ہے۔ پوری ریاست میں اردو ہائی اسکول 828 اور ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد 3 لاکھ سے زائد ہے۔ اردو جونیئر کالج یعنی ہائر سیکنڈری اسکول یا Plus 2, 100 ہیں اور طلبہ تقریباً 5 تا 6 ہزار۔ اسی طرح اردو ڈی۔ ایڈ کالج 42 ہیں جن میں لڑکوں کے لیے 4، لڑکیوں کے لیے 13 اور مخلوط تعلیم کے 25 کالج ہیں۔ B.Ed کالج ریاست میں ایسے ہیں جن میں اردو بحیثیت ایک مضمون کے پڑھائی جاری ہے۔ علاوہ ازیں گذشتہ برس سے مہاراشٹر میں B.Ed کے طلبہ کے لیے یہ سہولت دستیاب ہوئی ہے کہ وہ اپنے تمام مضامین کا امتحان اردو میں دے سکتے ہیں۔

بنیادی طور پر انسان دو خانوں میں منقسم ہے اول انفرادیت کے خانے میں اور دوم اجتماعیت کے۔ تعلیم کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کی انفرادی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی بھی ارتقا کے منازل طے کرتی رہے۔ اسی انفرادیت اور اجتماعیت کے مابین انسان کی فطری صلاحیتوں کا اجاگر ہونا تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ورثے کی بقا اور معاشرتی اتفاق و اتحاد کے لیے ضروری ہے۔ اس انفرادیت اور اجتماعیت کی بقا کا بہترین وسیلہ صرف زبان ہے اور اس کلیے کے تحت مادری زبان کی اہمیت مسلّم ہے۔

دنیا کے تمام مفکرین اور ماہرینِ تعلیم مادری زبان میں تعلیم کے معاملے پر صدفی صد متفق ہیں۔ گاندھی جی نے بجا طور پر کہا ہے کہ: ”مادری زبان میں تعلیم نہ دینا ایسا ہی ہے جیسے بچے کو ماں کے دودھ سے جدا کر دینا۔“

انسان اپنے مافی الضمیر کو جس طرح اچھے طریقے سے اپنی مادری زبان میں ادا کر سکتا ہے، دنیا کی کسی اور زبان میں ممکن نہیں۔ انسان کی پیدائش سے موت تک زندگی کے جتنے بھی مرحلے ہیں، خواہ ان میں تعلیم وتعلم ہو یا کاروبار زندگی، مذہبی امور ہوں یا سیاسی معاملات، غرض کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات اور تجربات ومشاہدات کی کارفرمائی نہ ہو اور ان کے اظہار کے لیے زبان ضروری ہے۔ اظہار خیال سے قبل، عمل سماعت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور بولنے کے مقابلے میں سننے کا عمل، دگنا، تگنا اور بعض اوقات چوگنا ہو جاتا ہے جہاں انسان اپنی خواہشات، پسند اور ناپسند کے اظہار کے لیے بے جان الفاظ میں صداؤں کی روح پھونکتا ہے، وہیں معاشرے کے دیگر افراد قوت سماعت کے پردے پر ردّ وقبول کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان تمام معاملات کو سامع یا مخاطب کی اپنی مادری زبان کے توسط سے بہم پہنچایا جائے تو اس کا حال ”دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے“ کے مصداق ہوگا یا پھر ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“۔

صوبائی، قومی اور بین الاقوامی زبانیں بھی مادری زبان کے بغیر سکھائی نہیں جا سکتیں۔ علاوہ ازیں مذہبی اور تہذیبی زبانوں کا علم بھی مادری زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ مادری زبان اگر اردو ہے تو اس کی قریب ترین زبانیں مثلاً عربی اور فارسی وغیرہ (جن میں نمایاں مماثلت رسم الخط کی ہے) مادری زبان کے ذریعے ہی سکھائی جاتی ہیں۔

ریاستِ مہاراشٹر میں جماعت اول میں اردو کے طلبہ کو مراٹھی اور انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن مسلسل دس سال تک یہ زبانیں پڑھنے کے باوجود طلبہ اپنی مادری زبان کے مقابلے میں انھیں ”نہیں“ کے برابر جانتے ہیں۔

اگر اردو معاشرے میں پلنے بڑھنے والے بچوں کے لیے ان کی مادری زبان میں تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نہ صرف بچوں کی اپنی زندگی میں چار چاند لگیں گے بلکہ مستقبل میں وہ معاشرے کے ذمے دار افراد ہوں گے۔

اگر تجربات اور مشاہدات کی ڈائری کی ورق گردانی کی جائے تو کئی ایسے مناظر ذہن کے پردے پر نظر آئیں گے جن میں بچوں کے گھروں میں ایک زبان بولی جارہی ہے، اطراف و جوانب میں دوسری زبان، اسکول میں تیسری اور درس و تدریس کا سلسلہ چوتھی زبان میں جاری ہے۔ اگر اس بات کا تجزیہ اس طرح کیا جائے کہ بچہ گھر میں اردو بول رہا ہے، محلے والے ہندی (بعض مقامات پر اردو کے نام پر بولی جانے والی "بولی") بول رہے ہیں۔ اسکول کے ماحول میں علاقائی زبان یعنی مراٹھی یا ہندی بولی جارہی ہے اور بچے کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے تو اس قسم کی صورت حال میں آپ مذکورہ بالا طالب علم کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کی حالت اس کمزور عمارت جیسی ہے جس کی ہر سیڑھی پر کائی کی پرتیں جمی ہوئی ہیں۔ سنبھلنے کی ہزار کوشش کے باوجود اس کا ان سیڑھیوں پر پھسلنا خارج از امکاں نہیں۔ چوٹوں سے اٹھنے والی ٹیسوں سے وہ جس طرح بلبلائے گا، معاشرہ اور سماج اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکے گا؟ آج کا اردو معاشرہ جس دورا ہے بلکہ ترا ہے پر کھڑا نظر آرہا ہے اس کی منزل کیا ہوگی یہ سوچنا ضروری ہے۔

Globalization سے قبل اردو کے تئیں اردو والوں کا جو رویہ تھا اس میں اور موجودہ رویے میں واضح تبدیلی نظر آرہی ہے۔ اب تو ریاست مہاراشٹر میں HSC کے بعد CET کے امتحانات بھی اردو میں ہورہے ہیں، باوجود اس کے اردو طلبہ کی گھٹتی ہوئی تعداد نہ صرف اردو معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلی کا پتا دے رہی ہے بلکہ آنے والے خطرے کی طرف اشارہ بھی کررہی ہے۔ یاد رکھیے مادری زبان قوموں کی زندگی کی ضامن ہوتی ہے جس میں ان کی تہذیب، ان کا تمدن اور ان کی ثقافت، یہاں تک کہ ان کا مذہب بھی اسی زبان سے جڑا ہوتا ہے، برصغیر میں مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی معاملات بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ برصغیر میں مسلمانوں کا تشخص اور اردو زبان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

اس وقت ریاست مہاراشٹر میں انگریزی میڈیم کے علاوہ دیگر میڈیم کے طلبہ کی جو تعداد اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروف ہے وہ انگریزی میڈیم کے طلبہ کے مقابلے میں کئی گنا ہے۔ یہی نہیں اگر آپ SSC یا HSC کی میرٹ لسٹ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ انگریزی میڈیم کے طلبہ کی تعداد، آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے جس کا ایک بڑا سبب بچوں کا اپنی مادری زبان کے بجائے غیر مادری زبان یعنی انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان نہیں ہے لیکن برصغیر میں مسلمانوں کے تشخص کی ضامن ہے۔

جس طرح مادری کی اہمیت مسلم ہے اسی طرح علاقائی زبان بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ کسی ملک میں مروج مختلف زبانوں کے روابط اسی قدر اہم ہیں جتنے اہم انسانوں کے درمیانی رشتے۔ یہ رشتے انسانی سماج میں ایک مضبوط زنجیر کا کام کرتے ہیں، اگر ان کے درمیان سے کوئی کڑی ٹوٹ جائے تو پوری زنجیر بکھر سکتی ہے۔

علاقائی زبان اکثریت کی زبان ہونے کی وجہ سے سرکاری اور عدالتی زبان بن جاتی ہے۔ اس کی جانکاری ہر اس فرد کے لیے اہم ہوتی ہے جو اس علاقے، صوبے یا ریاست میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ پیدائش سے موت تک، ملازمت سے کاروبار تک اور سماجی مراسم سے شادی بیاہ تک، تمام معاملات میں علاقائی زبان کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا علاقائی زبان کا سیکھنا ریاست میں بسنے والے تمام لوگوں کا فرض ہے اور ان پر اس زبان کا حق ہے۔ معاشرے کی تشکیل میں جہاں فرد کی اکائی کا حصہ ہوتا ہے وہیں فرد کی انفرادی اور اجتماعی تشکیل و تعمیر میں معاشرہ بھی اپنا کردار نبھاتا ہے۔

اقلیتوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ اگر وہ اکثریت کی زبان نہیں جانیں گے تو پھر اس سے کس زبان میں معاملات کریں گے؟ اگر آپ کو اپنے گھر میں سائل لگوانا ہے تو کیا آپ متعلقہ محکمے میں اپنی مادری زبان میں عرضی دیں گے؟ قدم قدم پر آپ کو اس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یاد رکھیے زبانیں دل جیتنے کا بھی ذریعہ ہوتی ہیں اور اپنی بات منوانے کا بھی۔ علاقائی زبان نہ سیکھ کر ہم نہ صرف اپنا نقصان کرتے ہیں بلکہ اپنے کنبے کا، پوری ریاست کا اور اس طرح پورے ملک کا نقصان کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کچھ دو اور کچھ لو کے اصولوں پر کاربند ہے۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہماری زبان اور تہذیب کے قریب آئیں تو ہمیں بھی دیگر زبانوں کو اہمیت دینی چاہیے۔ علاقائی اور دیگر زبانوں کی اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرمؐ اپنے صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ان میں کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ بھی موجود تھے، یہ وہی صحابیؓ ہیں جن کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام عرب کی حدود سے باہر پھیل رہا تھا، دیگر ممالک سے باقاعدہ وفد آرہے تھے جو عبرانی، سریانی اور دیگر زبانیں بولتے تھے اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے مترجم (ترجمان) ساتھ لاتے تھے۔ ایک موقع پر آپ کو کسی بات میں شک پیدا ہوا۔ تب آپؐ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے فرمایا۔ زیدؓ کثرت آمدِ وفود کی صورت میں مترجم اپنا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا تم عبرانی، سیریانی وغیرہ زبانیں سیکھ لو۔ ایک روایت کے مطابق وہ 15 دن کے لیے اور دوسری کے مطابق 6 ماہ کے لیے غائب ہوگئے اور جب لوٹے تو آپؓ نے نبی اکرمؐ سے کہا: "یا رسول اللہ! میں نے وہ تمام زبانیں سیکھ لی ہیں جن کا آپؐ نے حکم دیا تھا۔"

□□□

پتہ:
Department of Urdu
Ismail Yusoof College, Mumbai

محمد جہانگیر وارثی

مدارس کی جدید کاری

آج جو مدارس نظر آتے ہیں ان کا قیام سلجوقی سلطانوں کے عہد میں وزیراعظم نظام الملک 1092-1018 کے زمانے میں عمل میں آیا۔ انھوں نے عراق اور خراسان (ایران) میں لاتعداد مدرسے قائم کیے۔ ان میں سب سے بڑا مدرسہ ناظمیہ بغداد میں ہے جس کا قیام 1065 میں عمل میں آیا تھا۔ مدارس کے قیام کے ذریعے نظام الملک نے ایسے دانشوروں اور دینی علوم کے ماہرین کو تربیت دینے کی کوشش کی جو مسلمانوں کے علاقوں کی حکومتوں کو چلانے میں اپنے عہد کے سلاطین کی رہنمائی کرسکیں۔ نظام الملک نے ایسے دانشوروں اور دینی علوم کے ماہرین کو تربیت دینے کی کوشش کی جو مسلمانوں کے علاقوں کی حکومتوں کو چلانے میں اپنے عہد کے سلاطین کی رہنمائی کرسکیں۔ نظام الملک کی اصلاحات کے تحت سرکاری خزانے اوقاف سے اعلیٰ تعلیم کے ایسے ادارے قائم کیے گئے جہاں سے نیا طبقہ اشرافیہ پیدا ہوا۔

ہندوستان میں 1857 کی جنگ آزادی کے بعد عدالتوں کی زبان فارسی سے بدل کر انگریزی کردی گئی۔ مسلمانوں میں جو پڑھے لکھے لوگ روایتی مضامین میں گھروں پر مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے وہ انگریزی گرامر کے اسکولوں میں جانے کے اہل نہیں تھے۔ اگرچہ اس وقت سرسید احمد خاں نے اسلامی نظام میں جدت لانے کی کوشش کی اور ایک ایسا اسکول قائم کیا جس کو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا قاسم نانوتوی جیسی دوسری شخصیات نے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے کسی بھی نظام تعلیم میں عربی اور قرآن کی تدریس کو مرکزی حیثیت دینے پر مصر تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مسلم مفکرین کے دو الگ الگ دبستان بن گئے۔ نوآبادیات سے قبل ہندوستان میں کسی عالم کے لیے فقہ، تاریخ، سائنس تیر اندازی وغیرہ سیکھنا ضروری ہوتا تھا تاکہ وہ ایک لائق انتظام کار یا فقیہہ بن سکے، لیکن نوآبادیاتی عہد میں عالم وہ شخص ہوتا تھا جو صرف انگریزی اور انگریزی قانون جانے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس کا نصاب گھٹ کر صرف مذہبی قانون تک محدود ہوگیا۔ ہندوستان میں ان مدارس نے انسانی، اسلامی اور سماجی اقدار کے تحفظ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی طور طریقوں کی بقا میں بھی اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کے علاوہ علم کے فروغ، اسلامی لٹریچر کے ساتھ اسلامی عقیدے کا تحفظ، اسلامی کلچر کا فروغ اور ملک کی ترقی میں مدرسوں کا رول بھی سب پر ظاہر ہے۔ بچوں کو قرآن اور دیگر مذہبی کتابیں پڑھنے کے لیے چھوٹی عمروں میں ہی مدرسہ بھیجا جاتا ہے۔ ایسے طلبہ کی تعداد بہت کم ہے جو فقہ پڑھتے ہیں۔ بقیہ بچے پبلک یا پرائیویٹ سیکولر اسکولوں میں پڑھنے جاتے ہیں۔ مدارس سیکولر اردو و ہندی یا انگلش میڈیم اسکولوں کے مدِ مقابل نہیں کھڑے ہیں بلکہ یہ متبادل تعلیمی مراکز ہیں۔ اس نظام میں اصل مسئلہ اسلامی تعلیم کا ہے جو مذہبی مضامین کو سیکولر اور جدید مضامین سے قریب نہیں ہونے دیتا۔

حکومت ہند نے 1986 میں مدارس کی جدید کاری کا منصوبہ شروع کیا اور ان کے نصاب میں سائنس، ریاضی، انگریزی اور ہندی کو بھی شامل کیا لیکن بہت سے مدارس نے سرکاری مداخلت کے خوف سے حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کردیا۔ ان کا یہ انکار درست بھی تھا کیونکہ مدارس کی طرح ہی ہندو تعلیمی ادارے جنھیں ہم سنسکرت اسکول کہتے ہیں اسی طرح دھیرے دھیرے سرکاری نظام تعلیم میں مدغم کردیے گئے تھے تاہم اس ضمن میں حکومت کی کوششیں جاری ہیں اور اس ضمن میں حکومت کو محدود کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ مدارس کی اصلاح کے لیے یوگیندر اسکند نے اپنی ایک تحریر میں مدرسہ کے نصاب میں جدید مضامین شامل کرنے سے متعلق ہندوستان کے علما اور مسلم کارکنان کی کوششوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ لوگ ایسے مضامین اور کتابوں کو نصاب سے باہر کردینا چاہتے ہیں جن کی آج کوئی اہمیت و افادیت نہیں ہے اور طریقۂ تدریس میں بھی اصلاحات کے خواہش مند ہیں۔ یوگیندر اسکند نے ان طریقوں کو اجاگر کیا ہے جن کے ذریعے مدارس میں اصلاحات کا مطالبہ وضع کیا ہے ساتھ ہی اس کا جواب بھی فراہم کیا ہے۔ مثلاً اسلام میں علم کے مجموعی حصول کا احیا کیا جائے، تعلیمی دوہراپن ختم کردیا جائے اور علما کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں وغیرہ۔

پچھلے دنوں واشنگٹن ڈی سی میں وزیراعظم منموہن سنگھ نے ایک بیان دیا جس کے تناظر میں مدارس سے متعلق جملہ شبہات ختم ہوگئے۔ وزیراعظم کے مطابق ”ہمارے ملک میں 150 ملین شہری ایسے ہیں جو اسلامی عقیدے پر چلتے ہیں۔ میں ان کے حبِ وطن کے بارے میں ایک جذبۂ افتخار کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے ایک شخص بھی القاعدہ جیسے گروہ کی صفوں میں یا دوسری دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں شامل نہیں ہیں۔“ مدارس کے طلبہ مذہبی اور اسلامی تعلیم کے علاوہ کمپیوٹر کی تعلیم بھی حاصل کررہے ہیں اور نٹ پر سرفنگ بھی کرلیتے ہیں۔ مدارس کی جدید کاری کے حامی مولانا ولی رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانیہ مونگیر کے مطابق ”ہمارے یہاں کمپیوٹر ہیں، انگریزی میں کتابیں ہیں، ایسے طالب علم ہیں جو انگریزی بولتے ہیں لیکن انتہا پسند کوئی نہیں۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے کہ مدرسوں میں انتہا پسند پیدا کیے جاتے ہیں۔“ وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم مدارس میں جدید تعلیم شروع کرنے پر غور کریں۔ موجودہ مدرسۂ نصاب پر ازسرنو تجدید کے ساتھ غور وفکر کریں اور جدید مضامین ان میں شامل کریں۔ مدارس کو تربیت یافتہ ماڈرن ٹیچر اور جدید مضامین سائنس، کمپیوٹر اور آرٹس کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ ایک ایسا جدید نصاب بھی لازمی ہے جس میں مدارس کا اپنا مذہبی نصاب بھی بہر حال شامل رہے۔

(بہ شکریہ روزنامہ ”راشٹریہ سہارا“ دہلی
مورخہ 14 مارچ 2007)

□□□

احمد محفوظ

اردو کا شاہکار ناول — کئی چاند تھے سرآسماں

اردو کے معروف ادیب اسلم فرخی نے اپنے ایک مکتوب مورخہ 19 ستمبر 2006 مطبوعہ خبرنامۂ شب خون نمبر 2 میں لکھا ہے:

''کئی چاند تھے سرآسماں'' نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ میرے ہمسائے میں ایک ایسے صاحب رہتے ہیں جو مالیات کے بڑے ماہر ہیں اور بڑے مصروف انسان ہیں مگر میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے ''کئی چاند تھے سرآسماں'' کے ابتدائی بیس صفحے پڑھنے کے بعد اس کتاب کو اس طرح پڑھا کہ ہر چیز سے بے نیاز و بیگانہ ہوگئے۔ ایک اور صاحب نے جو ہمارے ملک کے بڑے سائنس داں ہیں مجھ سے یہ کہا کہ میری بیوی نے مجھے اس کتاب میں غرق دیکھ کر یہ پوچھا کہ آج تک تم نے کوئی کتاب اس انہماک سے نہیں پڑھی، اب تمھیں کیا ہوگیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی اس کتاب کے کچھ صفحے پڑھ لیتا ہے وہ پھر دنیا و مافیہا سے غافل ہوکر اس کے مطالعے میں غرق ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ''کئی چاند تھے سرآسماں'' اکیسویں صدی ہی کی نہیں، اردو فکشن کی بہترین کتاب ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' کے بارے میں اوپر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ کسی مبالغے پر مبنی نہیں ہیں بلکہ حقیقی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس ناول کی مقبولیت کی اور بھی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا ذکر آگے آئے گا۔

اس ناول پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ غیر معمولی تخلیقی کارنامہ یوں ہی اچانک وجود میں نہیں آگیا، بلکہ اس کے پیچھے وہ مقاصد اور منصوبے کارفرما رہے ہیں جن کا اظہار شمس الرحمٰن فاروقی کی دیگر تصانیف میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ابھی کچھ برس پہلے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' منظر عام پر آیا تو اس کی بھی غیر معمولی شہرت اور پذیرائی ہوئی، ساتھ ہی ادبی دنیا میں اس بات کا چرچا بھی دیر تک ہوتا رہا کہ ان افسانوں کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوئی ہے اور اس کا جو نقشہ سامنے آیا ہے، اس کی کوئی مثال اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ان افسانوں میں اردو کے مشاہیر شعرا مثلاً میر تقی میر، مرزا غالب اور غلام ہمدانی مصحفی وغیرہ کو مرکز میں رکھ کر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی صورت حال کو ایسی غیر معمولی مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اس عہد کے ادبی و تہذیبی مراکز بالخصوص دہلی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے متشکل ہو جاتی ہے۔ ہم شدت سے محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آج کا عہد جس ادبی روایت کا امین اور پاسدار ہے، اس کی حقیقی شکل وصورت کتنی دلکش اور تابناک تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے اس شکل وصورت کا جو بھی احساس تھا وہ نہایت دھندلا اور اس قدر غیر واضح تھا کہ کچھ بھی صاف سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لہٰذا اپنی روایت کے بارے میں اب تک ہمارے جو بھی احساسات تھے وہ نادیدہ یا کم دیدہ نقوش ہی کے مرہون منت تھے۔

یہاں برسبیل تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تہذیب اور ادب کے بارے میں منفی اور گمراہ کن خیالات و رجحانات کے پھیلنے یا پھیلائے جانے کا کام انیسویں صدی کے اواخر اور اس کے بعد اتنی تیزی کے ساتھ انجام پذیر ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہماری قدیم ادبی و تہذیبی روایت پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا اور اس طرح وہ تہذیبی انقطاع عمل میں آیا جس کے دور رس نتائج سے ہم اتنے عرصے بعد آج بھی دو چار ہیں۔ شروع ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی کے ایک طویل عرصے تک اس انقطاع کو اچھی طرح محسوس نہیں کیا گیا، اور اگر کہیں کچھ احساس ہوا بھی تو اس پر صرف رنج و افسوس کر لینا ہی کافی سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس ادبی و تہذیبی انقطاع کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا بلکہ اس کے اسباب وعوامل اور مضمرات پر پہلی بار نہایت شرح و بسط کے ساتھ کلام کیا۔ یہی نہیں، انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس انقطاع کے اثرات کو ختم کر کے اپنی قدیم ادبی و تہذیبی روایت سے رشتہ قائم اور مستحکم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ کلاسکی تہذیب اور شعریات کے حوالے سے خدائے سخن میر تقی میر پر عہد ساز کتاب ''شعر شور انگیز'' ہو یا مذکورہ افسانے ہوں، سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اب جب کہ یہ ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' اشاعت پذیر ہوا ہے تو اسے بھی شمس الرحمٰن فاروقی کے اس بڑے منصوبے کا اہم حصہ سمجھنا چاہیے، جس کے تحت وہ پچھلے کئی برسوں سے اپنی قدیم روایت کی بازیافت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ایک معنی میں دیکھا جائے تو فاروقی کے مذکورہ بالا افسانوں کو اس ناول کی تمہید یا نقش اول بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ موضوع، طرز بیان اور زبان کی نوعیت کے اعتبار سے ان افسانوں اور ناول میں بڑی

یکسانیت نظر آتی ہے۔ البتہ افسانوں میں اختصار کے سبب جو کچھ، محض اشاروں میں اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے، اسے ناول میں بہت پھیلا کر جزئیات کی پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اس بات سے یہ گمان نہ ہونا چاہیے کہ یہ ناول ان افسانوں کا تفصیلی بیان محض ہے۔ اسے مصنف کی تخلیقی ہنرمندی اور فنی مہارت کا واضح ثبوت ہی کہا جائے گا کہ اپنے وسیع معنوں میں موضوع اور زبان و بیان کی یکسانیت کے باوجود یہ ناول افسانوں سے نہ صرف مختلف تاثر پیش کرتا ہے بلکہ ہمیں یکسانیت کے احساس سے باز بھی رکھتا ہے۔ اس میں صنفی اختلاف کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی دخل ہے کہ افسانوں کے برخلاف ناول کے مرکز میں مصنف نے جس کردار کو قائم کیا ہے، وہ کسی مشہور اور بڑے کلاسیکی شاعر کا کردار نہیں، بلکہ ہماری تہذیبی تاریخ کی ایسی شخصیت ہے جسے دنیا وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کے نام سے جانتی ہے۔ انھیں وزیر خانم کو نواب مرزا داغ دہلوی کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ داغ دہلوی کو جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے سامنے دیکھا جائے تو وزیر خانم گمنام خاتون ہی کہی جائیں گی۔ یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ وزیر خانم کے بارے میں ہماری ادبی تاریخ عام طور سے خاموش رہی ہے۔ اب اس ناول میں انھیں مرکزی کردار کی حیثیت سے جس طرح پیش کیا گیا ہے اور حقائق و واقعات کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، وہ تاریخی طور پر خواہ پوری طرح مصدقہ نہ ہوں لیکن ان سے وزیر خانم کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ وزیر خانم کی شخصیت کی روشنی میں اس عہد کے ذہن اور مزاج و مذاق کو بھی سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

کتابی صورت میں اشاعت سے پہلے اس ناول کے کچھ حصے رسائل میں بھی شائع ہوئے۔ رسائل میں ان حصوں کا چھپنا تھا کہ ہر طرف سے ناول کے بارے میں تحسین آمیز بیانات آنے شروع ہو گئے۔ ان مطبوعہ حصوں سے لوگوں کو اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ مکمل صورت میں ناول کے خدوخال کیا ہوں گے۔ چنانچہ تعریف و تحسین کے ساتھ کچھ ایسے خیالات بھی سامنے آئے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ناول اگرچہ غیر معمولی خوبیوں کا حامل ہے اور اپنی مثال آپ ہے لیکن یہ جس عہد کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں کلام کرتا ہے، وہ اب ہمارے لیے کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس ناول میں جس طرح کی زبان استعمال ہوئی ہے، اب وہ متداول نہیں، اس لیے بڑی حد تک مشکل اور ناقابل فہم ٹھہرے گی۔ یہاں اگر ہم غور کریں تو پہلی بات جو کہی گئی ہے، اس کی تہ میں اس تہذیبی انقطاع کے اثرات کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے۔ اور زبان کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ ہمارے زمانے کے سہل پسند مزاج کی آئینہ داری کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال یہ دونوں باتیں چونکہ حقیقت سے بہت دور تھیں، اس لیے ہم نے دیکھا کہ عملاً غلط ثابت ہوئیں۔ آپ کہیں گے اس کا ثبوت کیا ہے؟ تو جواب میں اس مضمون کے آغاز میں منقولہ اقتباس ہی شاید کافی ہو، کیونکہ اس میں دونوں باتوں کا جواب موجود ہے۔ لیکن مزید عرض ہے کہ اس ناول کا پہلا ایڈیشن جو پاکستان سے شائع ہوا، اس کی شہرت اور مقبولیت کا شور ابھی پوری طرح تھما بھی نہیں تھا کہ مشہور انگریزی پبلشر پینگوئن بکس نے اس کا ہندوستانی اردو ایڈیشن شائع کر دیا۔ اتنے کم عرصے میں کسی اردو ناول کا نیا ایڈیشن منظر عام پر آنا، اس بات کی روشن دلیل نہیں تو اور کیا ہے کہ ناول بالکل نئے طرح کے موضوع اور خاص نوعیت کے زبان و بیان کا حامل ہونے کے باوجود اہل ذوق کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

جہاں تک ایک خاص عہد کی تاریخ و تہذیب کو موضوع بنانے کا معاملہ ہے تو ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ عہد ہمارے شعور و احساس کے کسی ان دیکھے گوشے میں اب بھی موجود ہے۔ ہم اپنے تہذیبی ماضی سے آج بھی اسی طرح وابستہ ہیں جس طرح ہمارے اسلاف اپنے تہذیبی ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ ایسا تسلسل ہے جو ہر عہد میں قائم رہتا ہے، خواہ خارجی سطح پر صورت حال کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو جائے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ سوا سو برس گزر جانے کے بعد بھی ''آب حیات'' کی شہرت، مقبولیت اور ادبی اہمیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اس کتاب میں ہمارے ادبی و تہذیبی ماضی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اس قدر زندہ اور متحرک ہے کہ ہم جب بھی اس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو خود کو ایک نئی دنیا میں پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کو ایک معنی میں ''جدید آب حیات'' بھی کہا جا سکتا ہے۔

یہ بات تو مبنی بر حقیقت ہے کہ اس ناول کی زبان آج کی زبان نہیں ہے، بلکہ اسے ماضی قریب کی زبان بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس اعتبار سے ناول میں مستعمل زبان کا وافر حصہ موجودہ قاری کے لیے نامانوس ضرور ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ نامانوس زبان کا یہ استعمال ناول کی خامی یا ناکامی پر محمول نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ناول کا تقاضا اور اس طرح اس کی بہت بڑی قوت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مصنف نے ناول میں بیانیہ کی جو حکمت عملی اختیار کی ہے، اس کی رو سے زبان کا بڑا حصہ وہ ہو ہی نہیں سکتا جسے ہم آج استعمال کرتے ہیں۔ یہاں بیانیہ کو اس طرح بروئے کار لایا گیا ہے کہ پورا ناول ایک سے زیادہ راویوں کے ذریعے بیان ہوا ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، ناول کا بڑا حصہ وزیر خانم کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔ وزیر خانم کے والد محمد یوسف سادہ کار ناول کے پانچویں باب بعنوان ''تصویر'' کے آغاز سے بطور حاضر راوی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ سنہ عیسوی1840 ہے اور اس وقت ان کی عمر 47 سال ہے۔ یہاں سے یوسف سادہ کار کا بیان ناول کے بیسویں باب تک جاری رہتا ہے، جب وزیر خانمAssistant Political Agentمارسٹن بلیک سے منسلک ہو کر جے پور چلی جاتی ہیں اس کے بعد کے واقعات غائب راوی کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔ بطور حاضر راوی یوسف سادہ کار اپنی سب سے چھوٹی بیٹی وزیر خانم کے ذکر سے پہلے اپنے خاندان اور اجداد کا حال بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہ تفصیلات نہایت دلچسپ اور حد درجہ لائق توجہ ہیں۔ان کے بیان میں مصنف کی تخلیقی مہارت کا جو اظہار ہوا ہے، وہ قابل داد ہے۔ یوسف سادہ کار کی خاندانی تفصیلات کے بیان کا جواز بھی ناول کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ یوسف سادہ کار کا بیان جہاں سے شروع ہوتا ہے، وہاں کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''میرا نام محمد یوسف سادہ کار ہے۔ میں کشمیری الاصل ہوں۔لیکن اصل معاملہ میرا اتنا سادہ نہیں، اور شروع سے بیان کروں تو بہت لمبا اور پیچ در پیچ ہے۔ لیکن شروع سے بیان نہ کروں تو اس کی باریکیاں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔''

ظاہر ہے اس بیان سے ان تفصیلات کا جواز فراہم ہوجاتا ہے جو محمد یوسف سادہ کار کی زبانی ناول میں مذکور ہوئی ہیں۔ چونکہ یہ زمانہ وسط انیسویں صدی کا ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں راوی بھی اسی زمانے کا ہے، لہٰذا یہ لازمی تھا کہ اس کے ذریعے جو کچھ بیان ہو، وہ اسی عہد کی زبان میں ہو۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا تقاضا ہی یہ تھا کہ اس میں زبان وہ استعمال ہو جو آج نہیں بلکہ انیسویں صدی میں یا اس سے پہلے مستعمل تھی۔ اس عہد کے ہندوستان بالخصوص دلی کی ادبی و تہذیبی فضا پر زبان و بیان کا جو رنگ چھایا ہوا تھا اسے ہم آج اس ناول کے ذریعے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

ناول کے ابتدائی چار ابواب کا بیانیہ بھی خاص طور سے توجہ کے لائق ہے۔دراصل ان ابواب میں وزیر خانم اور مارسٹن بلیک اور ان سے متولد اولادوں اور ان کے اخلاف کا بیان ہے۔ مارسٹن بلیک اور وزیر خانم سے دو اولادیں ہوئیں، ایک بیٹی سوفیہ عرف بادشاہ بیگم اور ایک بیٹا مارٹن بلیک عرف امیر مرزا۔ مارسٹن بلیک کی موت کے بعد وزیر خانم اپنی ان اولادوں سے محروم ہوگئیں اور یہ دونوں بچے مارسٹن بلیک ہی کے خاندان میں پلے بڑھے۔ پھر انگلستان جا کر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان ابواب میں ان کی اولادوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ ناول کے ایک کردار وسیم جعفر انھیں اولادوں میں سے ایک ہیں۔ ان تفصیلات کا بیان بھی حاضر راوی کے ذریعے ہوا ہے۔لیکن یہاں حاضر راوی کوئی حقیقی کردار نہیں بلکہ ایک فرضی کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ مصنف نے اس فرضی کردار کی تشکیل بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے۔چنانچہ ناول کے پہلے باب بعنوان ''وزیر خانم'' کے آغاز سے پہلے توسین میں لکھا گیا ہے''ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم کی یادداشتوں سے۔'' یہی فقرہ دوسرے اور تیسرے باب کے آغاز میں بھی درج ہے اور چوتھے باب کے شروع میں ''ڈاکٹر وسیم جعفر کی تحریرات پر مبنی'' لکھا ہوا ہے۔ ان ابواب میں بیان کردہ تفصیلات چونکہ تاریخی طور پر پوری طرح مصدقہ نہیں ہیں،اس لیے حاضر راوی کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی اسے فرضی کردار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وسیم جعفر کا کردار اس معنی میں حقیقی ہے کہ ان کا تعلق وزیر خانم کی اولادوں امیر مرزا اور بادشاہ بیگم کے خاندان سے ہے۔ البتہ ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی سے موسوم حاضر راوی قطعاً فرضی ہے۔ اس راوی کی تشکیل میں مصنف نے جدت طبع کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ راوی کے فرضی نام میں بھی ایک دلچسپ پہلو پنہاں ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے والد کا نام مولوی محمد خلیل الرحمٰن فاروقی اور دادا کا نام حکیم مولوی محمد اصغر فاروقی ہے۔ اس طرح مصنف نے اپنے والد اور جد بزرگوار کے ناموں کو ملا کر فرضی نام کی تشکیل اس خوبصورتی سے کی ہے کہ یہ نام فرضی معلوم ہی نہیں ہوتا۔

چونکہ ان ابواب کے آغاز میں ہی کہہ دیا گیا ہے کہ آگے جو کچھ بیان ہوگا اس کی بنیاد محض یادداشتوں پر ہے، لہٰذا اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر یہاں کوئی بات، کوئی واقعہ، کوئی تفصیل مبنی بر حقیقت نہ ٹھہرے یا تاریخی اعتبار سے غلط قرار پائے تو اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی یا اسے قابل گرفت نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ اصلاً اور اولاً یہ سارا بیان ہے تو ناول کا حصہ، کسی تاریخ کی کتاب کا جزو نہیں۔ علاوہ ازیں پہلے باب کا اولین اقتباس ہی ان باتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔

''وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم (پیدائش غالباً1811) محمد یوسف سادہ کار کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔لیکن محمد یوسف سادہ کار دہلوی الاصل نہ تھے، کشمیری تھے۔ یہ لوگ دہلی کب اور کیونکر پہنچے، اور دہلی میں ان پر کیا گزری، یہ داستان لمبی ہے۔اس کی تفصیلات پہلے بھی کچھ بہت واضح نہ تھیں، اور اب تو تمادی ایام کے باعث اور کچھ دوسری مصلحتوں کے باعث شاید بالکل بھلا دی گئی ہیں۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، وہ حسب ذیل ہے،لیکن ضروری نہیں کہ یہ سب تاریخی طور پر بالکل درست ہو۔''

اس اقتباس کا آخری فقرہ نہایت اہم اور معنی خیز ہے۔ یعنی یہ اس بات کا واضح اشارہ اور اعلان ہے کہ آگے جو بھی واقعات بیان ہوں گے وہ اگرچہ

غیر تاریخی تو نہ ہوں گے لیکن وہ سب ایسے بھی نہ ہوں گے جنھیں تاریخی طور پر بالکل درست سمجھا جانا ضروری ہو۔ اس بیان سے اس بات کا جواز مزید مستحکم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ فکشن ہے۔

میں یہ بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی اور قوت اس کے زبان و بیان اور جزئیات نگاری میں پوشیدہ ہے۔ ایک خاص عہد کی زبان کو دوبارہ زندہ کر کے اس طرح استعمال کرنا کہ واقعات بھی پوری طرح متشکل ہو جائیں اور بیانیہ کے اصول بھی مجروح نہ ہوں، نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس زبان کے روزمرہ اور محاورے کی خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے اور آداب گفتگو وغیرہ کے تمام لوازم کا پورا پورا پاس ولحاظ بھی قائم رہے۔ ان تمام باتوں کے لیے مطالعہ و مشاہدہ اور مشق و مزاولت کی جس منزل تک رسائی درکار ہوتی ہے، فاروقی صاحب نہ صرف وہاں تک پہنچے ہیں بلکہ اس پر ان کا بھرپور تصرف بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول میں مستعمل زبان کے سلسلے میں انھوں نے کتاب کے آخر میں خود لکھا ہے کہ ''میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ مکالموں میں، اور اگر بیانیہ کسی قدیم کردار کی زبانی، یا کسی قدیم کردار کے نقطۂ نظر سے بیان کیا جا رہا ہے تو بیانیہ میں بھی، کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جو اس زمانے میں مستعمل نہ تھا۔'' اس کے بعد وہ اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں'' ظاہر ہے کہ یہ بات لغات کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھی۔'' در اصل یہ بیان اعتراف سے زیادہ انکسار مزاج کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ لغات کی کتابیں تو ہمیشہ سب کے لیے موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں مندرج الفاظ کے خزانے کو کامیابی کے ساتھ وہی صرف میں لاتا ہے، جس کے مزاج کو اس سے مناسبت ہوتی ہے۔ اردو فارسی کی قدیم کلاسیکی روایت اور تہذیب سے فاروقی صاحب کے مزاج کی مناسبت اظہر من الشمس ہے۔ اس کا اظہار ان کی تحریر و تقریر سے عموماً ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے ایک خاص عہد میں مروج الفاظ و محاورات کی تلاش و تفحص میں لغات سے مدد ضرور لی ہے لیکن انھیں بیانیہ کا جزو بنانے کا اہم ترین اور مشکل ترین مرحلہ ان کی افتاد طبع اور غیر معمولی قوت بیان ہی کے ذریعے سر ہوا ہے۔ قدیم عہد میں الفاظ کے مخصوص معنوں میں استعمال کی ایک مثال یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ وزیر خانم، نواب شمس الدین احمد خاں کے دولت کدے پر پہلی بار تشریف لاتی ہیں اور خواتین کے لیے مخصوص مہمان خانے میں قیام پذیر ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ نواب صاحب جب مہمان خانے میں داخل ہوتے ہیں تو کہتے ہیں'' شب بخیر، وزیر خانم''۔ یہاں'' شب بخیر'' کا فقرہ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے جن معنوں میں آج یہ مروج ہے۔ چنانچہ حاشیے میں یہ وضاحت درج ہے:

''پرانے زمانے میں شام یا رات کو ملاقات کے وقت ''شب بخیر'' کہتے تھے، گویا یہ انگریزی Good Evening کا مرادف تھا۔ آج یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں جب رات کے لیے رخصت ہو رہے ہوں، یعنی اب یہ فقرہ Good Night کا مرادف ہو گیا ہے۔''

یہاں اہم بات صرف یہ نہیں ہے کہ ''شب بخیر'' کے فقرے کو مصنف نے قدیم معنی میں استعمال کیا ہے جس میں دلچسپ پہلو یہ بھی پنہاں ہے کہ اس فقرے کے موجودہ اور قدیم معنی ایک دوسرے کے متضاد ہیں، جیسا کہ حاشیے کی درج بالا عبارت سے ظاہر ہے، بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ فقرہ موقع اور محل سے بھی گہری مناسبت رکھتا ہے۔

ناول میں جگہ جگہ اردو اور فارسی اشعار کا استعمال ایک طرف جہاں بیانیہ کو نیا رنگ عطا کرتا ہے وہیں اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ ہماری قدیم ادبی تہذیب میں شعر سننے سنانے کا عام رواج تھا۔ اسے آداب محفل اور طرز گفتگو وغیرہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ موقع و محل کے لحاظ سے دلچسپ اور اعلیٰ درجے کے شعر سنانا شخصیت کی خوبی اور بڑائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور جواب میں برمحل شعر پڑھ دینا مزید خوبی کی بات تھی۔ ناول میں یہ پہلو جس خوبصورتی اور چابکدستی کے ساتھ نمایاں ہوا ہے، اس کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہوگی۔ مصنف نے کمال ہنرمندی کے ساتھ اشعار کو جا بجا عبارتوں اور مکالموں میں اس طرح کھپایا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ اشعار انھیں موقعوں کے لیے کہے گئے تھے۔ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ بیان کے دوران ان اشعار کو الگ سے لا کر رکھا گیا ہے۔ یہاں بھی فاروقی صاحب کے مطالعے کی وسعت، اردو فارسی کی شعری روایت پر گہری نظر اور ان کا علمی استحضار پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جہاں جہاں فارسی اشعار لائے گئے ہیں وہاں ان کا اردو ترجمہ درج نہیں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے ناول کی خامی پر محمول کریں۔ لیکن اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہاں فارسی اشعار بیانیہ کا جزو بنا کر لائے گئے ہیں، اس لیے ان کا ترجمہ بیانیہ کے بے ساختہ پن کو ضرور مجروح کر دیتا۔ یہاں اشعار کے استعمال کی کچھ مثالیں پیش کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا۔

محمد یحییٰ بڑگامی کی نیک سیرت بیوی اور داؤد و یعقوب کی ماں بشیر النسا نے شوہر کے انتقال کے چند ہی مہینے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کے ذکر کے فوراً بعد یہ برمحل شعر درج ہے۔

از موت و حیات چند پرسی آخر
خورشید بہ روزنے در افتاد و برفت

(ترجمہ: زندگی اور موت کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ بس یہ سمجھو کہ دھوپ روزن سے اندر آئی اور گزر گئی)

ایک موقع پر نواب شمس الدین احمد وزیر خانم کے یہاں تشریف فرما ہیں۔ نواب موصوف اور وزیر خانم کے درمیان لطف کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ملحوظ رہے کہ مارسٹن بلیک کی موت کے بعد وزیر خانم ابھی نواب موصوف سے باقاعدہ منسلک نہیں ہوئی ہیں۔ البتہ دونوں طرف سے وفور شوق اور شدید چاہت کا کچھ نہ کچھ اظہار ہونے لگا ہے۔ اس وقت نواب شمس الدین اور وزیر خانم کے بیچ جو مکالمہ ہو رہا ہے اس کا کچھ حصہ ملاحظہ کریں۔ نواب صاحب وزیر خانم کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''تم نے پورے مہتاب کی طرح اس گھر کو روشن کر رکھا ہے اندھا ہی ہو جو تمھاری خوبیاں نہ دیکھ پائے۔ ہمارا بس چلے تو تمھیں چادر مہتاب کی طرح اوڑھ کر سو جائیں۔''

''سرکار نے مجھے چاند کہا، میری توقیر کی۔ لیکن عالی جاہ تو شمس ریاست اور مہر امارت ہیں، سورج کے آگے چاند کی کچھ حیثیت نہیں۔ عالی جاہ نے ضرور سنا ہوگا، نور القمر مستفید من الشمس۔ سورج اپنی منزل میں چلا جائے گا اور چادر مہتاب لپٹی لپٹائی دھری رہ جائے گی۔''

''بھئی واللہ۔ آپ کے فقرے کیا ہیں، فقرہ بازیاں ہیں۔ کہیں ان فقروں میں آپ ہمیں اڑا ہی نہ دیں۔'' نواب نے ہنس کر کہا۔

''سرکار ہم تو خود پر کاہ ہیں، حضور کی نسیم شفقت کے منتظر ہیں کہ ہمیں اڑا لے جائے اور آسودۂ منزل کر دے۔''

''اور منزل کہاں ہے آپ کی، یہ تو بتایا نہیں آپ نے۔''

''پر کاہ کی منزل کیا، تر و تازہ ہو تو گلدستہ، خشک اور خزاں رسیدہ ہو تو گلخن۔''

''لیکن آپ نہ پر کاہ ہیں نہ خزاں رسیدہ۔ ابھی تو آپ پر ٹھیک سے بہار آئی ہی نہیں۔'' وزیر نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور طالب آملی کا شعر پڑھا۔

ز غارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

(ترجمہ: تیرا چمن کو غارت کرنا بہار پر بے شمار احسانات کا سبب ٹھہرا ہے۔ کیونکہ پھول تیرے ہاتھ میں آکر شاخ پر سے زیادہ تازہ ہو جاتا ہے۔)

اس شعر کے برمحل اور برجستہ استعمال سے قطع نظر مکالموں کی بے ساختگی اور ان میں رعایتوں اور مناسبتوں کی خوبصورت کارفرمائی صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ درج بالا دونوں فارسی اشعار کا ترجمہ خود راقم الحروف نے کیا ہے۔

ناول میں کرداروں کی تعداد خاصی ہے۔ اور تقریباً تمام اہم کرداروں کا ربط براہ راست یا بالواسطہ وزیر خانم سے ہے جن کی حیثیت ناول میں مرکزی کردار کی ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں مارسٹن بلیک، ولیم فریزر، نواب شمس الدین احمد خاں، محمد یحییٰ بڈگامی، میاں مخصوص اللہ، مرزا غالب، عمدہ خانم عرف مجھلی بیگم، محمد یوسف سادہ کار، نواب مرزا داغ، ولی عہد سوئم میرزا فخرو بہادر وغیرہ ہیں۔ مصنف نے تمام کرداروں کو ان کے مقام و مرتبہ اور شخصی خصوصیات کے پورے التزام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وزیر خانم کو ناول میں چار اشخاص کے ساتھ یکے بعد دیگرے وابستہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں مارسٹن بلیک اور نواب شمس الدین احمد خاں کے ساتھ وہ بغیر نکاح وابستہ رہیں اور آغا مرزا تراب علی اور میرزا فخرو بہادر ولی عہد سوئم سے ان کا مناکحت کا رشتہ رہا۔ ان چاروں افراد کے بیان اور ان کے کردار کی خصوصیات کی تفصیل میں مصنف نے کمال ہنرمندی کا اظہار کیا ہے۔ ان میں مارسٹن بلیک اور نواب شمس الدین احمد سے وزیر خانم کی وابستگی کے زمانے کو خاص اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ اول تو وزیر خانم نے ان کے ساتھ نسبتاً زیادہ طویل عرصہ گزارا، دوسرے یہ کہ ان رشتوں کی تہ میں فریقین کی طرف سے جذباتی شدت اور دل کے معاملے کو بھی خاصا دخل تھا۔

یہ ناول اوپری سطح پر محبت کی ایسی داستان ہے جس میں کامیابی اور ناکامی و محرومی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ لیکن اس کی تہ میں ایسی حقیقتیں بھی پوشیدہ ہیں جو انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخی، سیاسی اور تہذیبی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اس زمانے میں ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں کا رویہ کیا تھا اور انگریز حکام اپنی طاقت کو روز بروز مزید مستحکم کرنے کے لیے کیا کیا حکمت عملی اختیار کر رہے تھے، اس کی طرف بھی بہت سے اشارے ناول میں موجود ہیں۔ ولیم فریزر کا قتل ناول کے اہم ترین واقعات میں سے ایک ہے۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان خاص کر دہلی کی معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کا اندازہ بھی ناول سے ہوتا ہے۔

مختلف علوم و فنون کا بیان ان کی مکمل تفصیلات اور تمام باریکیوں کے ساتھ ناول کے صفحات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مصنف کی معلومات اور مشاہدات کی وسعت کہاں تک ہے۔ عام اور معمولی چیزوں کے بارے میں بھی یہاں جس تفصیل سے کام لیا گیا ہے وہ بلا شبہ دیدنی ہے۔ بنی ٹھنی کی تصویر کا بیان ہو، کشمیر کے مختلف مقامات کا ذکر ہو، گھریلو ساز و سامان، کھانا پینا، لباس و پوشاک، عادات و اطوار، ان تمام کے بارے میں حد درجہ باریک بینی سے کام لے کر انھیں ہمارے سامنے آئینہ کر دیا گیا ہے۔ بنی ٹھنی کی تصویر کے بیان میں مصنف نے غیر معمولی باریک بینی کا ثبوت پیش کیا ہے:

''کاسنی رنگ کی کامدار ساری، پلو سے سر ڈھکا ہوا، لیکن ساری اس قدر باریک تھی کہ سر کا ایک ایک بال، مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرے، ماتھے

کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت، ہیرے، گومید اور تامڑے صاف جھلکتے تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، منھ پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق، اور مصور اس قدر مشاق تھا کہ مسکراہٹ کی وجہ سے کانوں کی لوؤں کی سرخی اور خفیف سا کھنچاؤ تک دکھائی دیتا تھا، بلکہ محسوس ہوتا تھا۔ بڑی بڑی جامنی آنکھیں، پتلیوں کی سیاہی میں نیلگونی جھلکتی ہوئی، سیدھی ناک، بظاہر ذرا لمبی لیکن دوبارہ دیکھیں تو بالکل مناسب معلوم ہو، ناک میں بڑا سا بلاق جس میں ایک سرئی موتی۔ گردن اونچی اور نازک، نخوت اور اعتماد کی بلندی اس میں نمایاں تھی۔ گردن میں گول ترشے ہوئے جامنیا کے دانوں کا ہار، جس میں جگہ جگہ کسی زردی مائل گلابی پتھر کے بڑے بڑے دانے کشمیری ناشپاتیوں کی شکل میں تراشے گئے تھے۔"

ملحوظ رہے کہ یہاں میں نے تصویر کی جزئیات کا مکمل بیان نقل نہیں کیا ہے۔ درج بالا اقتباس سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف کی چشمِ تخیل نے کس قدر باریک بینی سے کام لیا ہے اور قوتِ بیان نے تفصیلات کو کس خوبی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ ناول انیسویں صدی سے بھی بہت پہلے سے شروع ہو کر سال 1856 میں ختم ہوتا ہے۔ اس پورے عرصے کا بیان ہمیں ایسی دنیا کی سیر کراتا ہے جو معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے بے حد معمور ہے۔ یہاں کی زندگی اور اس کی اقدار نہایت مستحکم اور توانا ہیں۔ ہر طرف زندگی کی چہل پہل اور تحرک نظر آتا ہے۔ یہ دنیا ایسی ہے جس پر کوئی بھی عہد فخر کر سکتا ہے۔ یہاں کی ادبی تہذیب بھی پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور دنیا کی دوسری بڑی تہذیبوں سے خود کو کم نہیں سمجھتی۔ لیکن پھر زمانے کی بساط الٹتی ہے اور سماں بدل جاتا ہے۔ ناول کے پورے پس منظر میں اس کا عنوان "کئی چاند تھے سرِ آسماں" جو احمد مشتاق کے درج ذیل شعر سے ماخوذ ہے، اپنی معنی خیزی نمایاں کرتا ہے۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

ناول کے خاتمے کے فوراً بعد قدیم انگریزی شاعر اور فکشن نگار Oliver Goldsmith (1728-1774) کی مشہور نظم "مسافر" The Traveller (مطبوعہ 1764) کی تین سطریں (اردو ترجمہ) بطور اختتامیہ درج ہیں جو حسب ذیل ہیں:

میری جوانی کے دن در بدری میں گئے اور فکر و الم میں
نہ تھمنے والے قدموں کے ساتھ کسی خیر گریز پا کے تعاقب پر مجبور
وہ جو اپنی جھلک دکھا دکھا کر میرا منھ چڑاتا رہتا ہے

ان سطور سے معنی و مفہوم کے جو پہلو نکلتے ہیں وہ درج بالا شعر اور عنوان "کئی چاند تھے سرِ آسماں" سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔ اور یہ سب مل کر ناول کے تناظر کو زمان و مکاں کے وسیع امکانات سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ ناول خارجی واقعات کا بیانِ محض نہ ہو کر ہمارے ادبی و تہذیبی حافظے کی علامت بھی بن جاتا ہے۔

[بشکریہ سہ ماہی 'نئی کتاب' (1)
(اپریل۔ جون 2007) نئی دہلی]

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس / مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔ اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ (یوسف ناظم)

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-066 110

غلام نبی خیال

یونان کا کلاسیکی ڈراما

پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ اور اس سے پہلے اور بعد کا ایک مخصوص دور یونانِ قدیم میں فن، ادب، فلسفہ اور دیگر فنونِ لطیفہ کی نشاۃ الثانیہ کا عہدِ زرّیں تھا۔ یہی وہ دور تھا جب سقراط، افلاطون اور ارسطو نے فلسفۂ حیات وممات اور زندگی کے اخلاق وآداب کے لیے اچھوتے معیار واضع کیے۔ ہومر یونانی رزمیہ کا بابائے آدم بن کر سامنے آگیا۔ سیفو نے جنس کی جبلت کو اپنی رومانی شاعری کا بنیادی جزو بنایا اور دنیا میں پہلی بار شدتِ جذبات اور لذتِ ہوس سے بھر پور عشق ومحبت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شاعری تخلیق کی۔ اسی زمانے میں قلم بند کی گئی ہیروڈوٹس کی تاریخ کو دنیا میں تاریخ کی اولین شیرازہ بندی کا شرف حاصل ہوا اور اس قدیم یونان میں جالینوس نے حکمت کے نئے چراغوں سے عوام کے لیے صحت یابی کے میزان مقرر کیے۔ اسی زرّیں یونان میں ایسکائی لس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کے المیہ ڈرامے اور ارسٹوفینیز کے تخلیق کردہ طربیے مکمل ڈرامے کی صنف میں فنی طور پر متعارف ہوئے۔ یونان کے کلاسیکی ڈراموں کو عام طور پر دیوی دیوتاؤں کے حالات پر مبنی دیو مالا ہی سے اخذ کیا جاتا تھا جنھیں ان فن پاروں میں انسانوں ہی کی طرح جذبات، محسوسات، خیالات اور اقدامات کے ماتحت کام کرنے والے اور زندہ رہنے والوں کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ دیوتا ظالم بھی ہیں اور زانی بھی۔ وہ رحم کرنے والے بھی ہیں اور اپنے دشمنوں کو پتھر سے مجسموں میں تبدیل کرتے وقت وہ کسی انسانی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

یونانی ڈرامے کی عوام کے سامنے پیش کش کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب اسے خمریات کے دیوتا ڈیونی سس یا باکس دیوتا کے اعزاز میں ایک سالانہ مقابلے میں اداکاروں کے ذریعے متعارف کیا گیا۔ یونان کے شہر ایتھنز میں منعقدہ اس مقابلے میں ہر ڈراما نگار تین المیے اور ایک طربیہ پیش کرنے کا پابند تھا اور انعام یافتہ ڈراما نگار کے سر کو زیتون کے پتوں سے آراستہ ایک تاج سے سجایا جاتا تھا۔

ڈرامائی ادب میں المیہ ایتھنز میں لوگوں کے لیے ادوارِ قدیم ہی سے تفریح کا ایک محبوب ذریعہ تھا۔ اگرچہ رزمیہ بھی عوام کے سامنے گا گا کر پیش کیا جاتا تھا لیکن اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو بعد میں المیہ ڈرامے یا ٹریجڈی کے حصے میں آئی۔ ''الیاڈ'' اور ''اوڈیسی'' کے مصنف ہومر نے کتھارا نامی ایک تار والے ساز کے ساتھ اپنے یہ دونوں رزمیے گا گا کر دوسروں کو سنائے لیکن اس کی میٹھی آواز اور ترنم بھی سامعین کا دل نہیں لبھا سکے اگرچہ بعد میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر یہ دونوں تخلیقات ساری دنیا میں یکتائے زمانہ فن پاروں میں شامل کی گئیں۔

ڈراما یونانی زبان میں حرکت کو کہتے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر اس وقت یونان میں یہ دستور تھا کہ ڈراما نویس اپنی تخلیق کو اسٹیج پر پیش کرنے کے عمل میں خود بھی شامل ہوتا تھا۔ اسے حکام کی طرف سے اداکار اور دیگر ساز و سامان فراہم کیا جاتا تھا جس کے لیے سرکار رقومات بھی بہم کرتی تھی مگر ڈرامائی پیش کش کی کامیابی یا ناکامیابی صرف مصنف کی کارکردگی کا ماحصل تصور کی جاتی تھی۔ ان ڈراموں میں کسی عورت کو اداکاری کرنے کی اجازت حاصل نہیں ہوتی تھی کیونکہ ملک کے زعما اور امرا اس خدشے میں مبتلا تھے کہ کہیں ان کی خواتینِ خانہ بھی اس لہو ولعب میں شریک ہو کر ان کی بدنامی کا باعث نہ بن جائیں۔ بعد میں خواتین اداکاراؤں نے ان ڈراموں میں نقاب پہن کر حصہ لینا شروع کیا تا کہ ناظرین انھیں پہچان نہ سکیں۔ بصورتِ دیگر نوجوان اور خوبصورت لڑکے ہی دلکش نسوانی کرداروں کی اداکاری کرتے تھے۔

یونان کے کلاسیکی ڈرامے کی شاندار عمارت کو جس عدیم المثال زیب وزینت سے ایسکائی لس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز دمزاح اور طنز نگار، ارسٹوفینیز نے پیراستہ کیا اس کی مثال دنیا کے کسی ڈرامائی ادب میں آج تک نہیں ملتی۔ ایسکائی لس (525-456 قبل مسیح) جسے یونان کا ''بابائے المیہ'' کہتے ہیں، ایتھنز کے متصل الیوسس کے قصبے میں پیدا ہوا۔ اسے بچپن سے ہی کھیل کود اور مبارزت کا شوق تھا۔ اس نے مراتھن میں پارسی بادشاہ دارا کی فوجوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا جس کا ذکر اس نے اس قطعہ میں بھی کیا ہے جو اس کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

ایسکائی لس جوانی میں انگور کے ایک باغ میں کام کرنے لگا جہاں ایک روز ڈیونی سس نے خواب میں آ کر اسے یہ بشارت دی کہ وہ المیہ کے فن کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے اور اس شعبے میں اسے شہرت حاصل ہوگی۔ اس کے بعد ایسکائی لس نے چھبیس سال کی عمر میں اپنا پہلا المیہ ڈراما تحریر کیا۔

ایسکائی لس نے اگرچہ اپنی اکہتر سالہ زندگی میں کئی ڈرامے لکھے لیکن

اس کے تحریر کردہ صرف سات ڈرامے ہی موجود رہ سکے۔ باقی ستر سے نوے ڈرامے زمانے کی دست برد کا شکار ہو چکے ہیں۔

ان فن پاروں میں ''اگامیمنان'' سب سے زیادہ مشہور ہے جو اس یونانی سپہ سالار کی المناک کہانی بیان کرتا ہے جس نے اپنے بھائی مینی لاس کے لیے اس لیے ٹرائے کے شہر پر چڑھائی میں حصہ لیا کہ مینی لاس کی بیوی ہیلن کو ٹرائے کے شہزادے پارس نے اغوا کر کے اپنی داشتہ بنا لیا تھا۔

اس دس سالہ جنگ میں ٹرائے کا سارا شہر زمین بوس ہوا اور لاتعداد انسان اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ اس طویل جنگ کے آخری دنوں کا حال ہومر نے ''الیاڈ'' میں بیان کیا ہے جسے دنیا کی سب سے زیادہ پر اثر رزمیہ داستان کا مرتبہ حاصل ہے۔

اگامیمنان بعد میں اپنی بے وفا بیوی کلے ٹیم نیسٹرا اور اس کے عاشق ایجستھس کے ہاتھوں بڑی بے رحمی سے قتل ہوا۔

ایسکائی لس کے ڈراموں کی خاصیت یہ ہے کہ ان میں ڈراما نگار کے فنِ کمال کی نزاکت اور تخیل کی بلندی ڈراما دیکھنے والوں یا پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو مسحور کر دیتی ہے۔ اس فنکارانہ جذبات میں ایسکائی لس نے اپنے دو ہم عصروں سوفوکلیز اور یوری پیڈیز پر خاص سبقت حاصل کر لی ہے۔

ایسکائی لس کے ڈراموں میں مذہب اور اخلاقیات کی قدروں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جن کے ذریعے اس نے دیوی دیوتاؤں کے تئیں توقیر و تحسین کا اظہار کیا ہے اور گناہوں کی پاداش میں انھی کے ہاتھوں سزا پانے کے فلسفہ کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ ایسکائی لس کو ڈرامائی مقابلوں میں کئی بار اولین اعزاز سے نوازا گیا۔

سوفوکلیز (495-406ق م) یونان کا دوسرا ممتاز ڈراما نگار ہے جو ایتھنز کے قرب میں کولونس کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس طرح سے وہ ایسکائی لس نے عمر میں تیس سال چھوٹا اور یوری پیڈیز سے پندرہ سال بڑا تھا۔ سوفوکلیز کا باپ ایک متمول اور بارسوخ شہری تھا جس نے اپنے اس بیٹے کو شاعری اور موسیقی کے فن میں تربیت دلانے کی غرض سے شاندار انتظام کیا۔ اسی تربیت کے نتیجے کے طور پر سوفوکلیز نے رقص و نغمہ کی اس تقریب کی رہنمائی کی جو سلاس میں اس کے وطن کی فتح کے جشن کے موقع پر منعقد کی گئی تھی۔ جوانی میں سوفوکلیز شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ اس بات کا اظہار اس نے اپنے ہی ایک مکالمے میں کیا ہے جسے افلاطون نے درج کیا ہے۔ سوفوکلیز کہتا ہے۔ ''میں اپنی پیرانہ سالی کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے خواہشات کے عذاب سے آزاد کر لیا۔'' سوفوکلیز کے بھی صرف سات ڈرامے حوادثِ زمانہ سے محفوظ رہ سکے ہیں جن میں موضوعاتی طور پر ایک دوسرے سے منسلک تین المیہ ڈراموں پر مشتمل ''ایڈیپس ریکس'' اس کا لافانی شاہکار ہے۔ ایڈیپس بادشاہ، ایڈیپس کولونس میں اور انٹی گنی نام کے اس مسلسل ڈرامے میں سوفوکلیز نے ایک ایسے بدقسمت بادشاہ کی غم ناک کہانی بیان کی جس نے تقدیر کے ہاتھوں آلۂ کار بن کر اپنے باپ کو قتل کیا اور بے خبری میں اپنی ہی ماں کے ساتھ شادی کر لی۔ جب اس کی ماں کو اس ہولناک عمل کا علم ہوا تو اس نے خودکشی کر لی اور ایڈیپس کو بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑا۔ سوفوکلیز پر اغلام بازی کا بھی الزام ہے۔ پلوٹارک نے اپنی ''پیراکلیز کے سوانح'' نامی کتاب میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے کہ ایک سمندری مہم جوئی کے دوران سوفوکلیز ایک نوجوان رنگروٹ کی اسی طرح بے تحاشا تعریفیں کرتا رہا جس طرح ایک عاشق اپنی محبوبہ کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے۔ اس پر پیراکلیز نے اسے زبردست تنبیہ کی اور اسے خبردار کیا کہ ''ایک فوجی افسر کو نہ صرف اپنے ہاتھ پاک و صاف رکھنے چاہئیں بلکہ اسے اپنی آنکھوں پر بھی قابو رکھنا چاہیے۔'' ارسطو نے سوفوکلیز کے ایڈیپس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک مکمل المیہ ہے جس میں اس نے ایک ایسا اعلیٰ ترین معیار قائم کر لیا ہے جس کی بدولت اس کے بعد کے یونان میں بھی اسے عزت و احترام حاصل رہا۔ سوفوکلیز عمر دراز پا کر 406ق م میں وفات پا گیا۔

یوری پیڈیز (480-406ق م) میں سالامس کے جزیرے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اگرچہ ایک باوسیلہ اور باعزت شہری تھا لیکن اس کی ماں کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ نچلے درجے کے ایک گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور جڑی بوٹیاں بیچنے کا کام کرتی تھی۔ اسی تناظر میں اس کا حریف کامیڈی نگار ارسٹوفینیز اپنے ''مینڈک'' نام کے ڈرامے میں کہتا ہے کہ ''یوری پیڈیز خود پست ذات کا فرد تھا جس کی ماں سڑکوں پر میوے، پھول اور جڑی بوٹیاں بیچتی تھی۔ یونانی دیومالا میں یہ حکایت درج ہے کہ یوری پیڈیز کے باپ کو ایک غیبی آواز نے یہ مژدہ سنایا کہ اس کے ایک بیٹا ہوگا جس کی ہر فرد بشر عزت کرے گا اور جو شہرت اور مقبولیت کا پیکر ہوگا۔ یوری پیڈیز ایک بسیار نگار ڈراما نویس تھا۔ اس کے تخلیق کردہ ڈراموں کی تعداد بہتر سے لے کر بیانوے تک بتائی جاتی ہے جن میں صرف انیس ڈرامے محفوظ رہ سکے ہیں جو آج بھی ہمارے جذبات میں جولانیاں پیدا کرتے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں ڈرامائی مقابلوں میں چار بار پہلا انعام حاصل کیا اور بعد از مرگ بھی اسے ایک بار اس اعزاز سے نوازا گیا۔ یوری پیڈیز کی زندگی کے آخری سال میگنیشیا اور مقدونیہ میں بسر ہوئے۔ اس نے اپنی پہلی بیوی ملیسٹو کو بدچلنی کی بنا پر طلاق دی۔ اس نے دوسری شادی چاپر نام کی خاتون سے کی لیکن اس کے بعد بھی وہ بدنصیبی کے عالم میں مبتلا رہا۔ یوری پیڈیز 406ق م میں اس وقت زخمی ہو کر فوت ہوا

جب اس کے دشمنوں نے اس پر خونخوار کتے چھوڑ دیے جو اسے لہولہان کر کے اس کی حادثاتی موت کا باعث بن گئے۔ یوری پیڈیز کو اگرچہ وطن سے دور پیلا کے مقام پر سپرد خاک کیا گیا لیکن اس کے آبائی شہر ایتھنز میں بھی اس کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی گئی۔ یوری پیڈیز کے زمانے تک یونانی ڈراما کمالِ فن کی رفعتوں کو چھو چکا تھا جس کی آبیاری یکے بعد دیگرے اسکائی لس سفوکلیز اور ارسٹوفینز نے کی تھی۔ یوری پیڈیز کے ڈراموں میں ''میڈیا'' سب سے چونکا دینے والا جذباتی ڈراما ہے۔ اس کی کہانی ایک جادوئی حسینہ میڈیا کے ناقابل تسخیر عزم کے اردگرد گھومتی ہے جو اپنی سوتن کے ساتھ ساتھ اپنے دو بچوں کو بھی بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیتی ہے کیونکہ اس کے خاوند جیسن نے ایک دوسری عورت سے بھی شادی کی تھی۔ اس ڈرامے کا وہ آخری حصہ پڑھتے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جس میں میڈیا اپنی سوتن کو اپنے بچوں کے ہاتھوں زہر میں ڈوبا ہوا ایک نیا لباس تحفہ کے طور پر بھیجتی ہے جسے پہنتے ہی یہ عورت تڑپ تڑپ کر مر جاتی ہے اور اس خوف کے مارے کہ اب اس کے بچوں کو بھی اس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا جائے گا وہ خود ہی انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ یونانی المیہ نگار عام طور پر اپنے ڈراموں کے درد بھرے انجام کو دیوتاؤں کی کارکردگی سے ہی تعبیر کرتے تھے۔ میڈیا کے اختتام پر بھی یوری پیڈیز کہتا ہے:

''دیوتا کئی صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں کئی باتیں عجیب و غریب طریقے سے اختتام کو پہنچتی ہیں جو ہم چاہتے ہیں کہ ہو جائے، وہ ہوتا نہیں اور جن باتوں کی ذرہ بھر بھی توقع نہیں ہوتی انھیں دیوتا خود ہی سرانجام دیتے ہیں اور اس کہانی میں بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا ہے۔''

یوری پیڈیز کے ڈراموں میں ہزاروں ایسے مکالمے موجود ہیں جو آج بھی یادگار مقولوں کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''جب نیک سیرت لوگ مر جاتے ہیں تو ان کی نیکی خاک میں نہیں ملتی بلکہ وہ ان کی نظروں سے دور ہونے کے باوجود باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک برے لوگوں کا تعلق ہے ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ختم ہو کر انھی کے ساتھ دفن ہو جاتا ہے۔'' ارسٹوفینز (444-388ق م) یونانی ڈراما نویسوں کی آخری معتبر کڑی ہے جو طربیہ ڈرامے اور طنزیہ نظمیں لکھتا تھا۔ اگرچہ اس کی پیدائش کا پسِ منظر اور حالات زندگی دستاویزی اور تاریخی شواہد کے ساتھ موجود نہیں لیکن عام طور پر ایتھنز ہی کو اس کی جائے پیدائش مانا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے سالِ پیدائش اور تاریخ وفات میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ارسٹوفینز کے بھی ایک درجن بھر ڈرامے موجود ہیں جن میں اس نے اپنے ہم عصروں کے فن اور تخلیقی صلاحیتوں کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ ارسٹوفینز کے طربیہ ڈراموں میں اس وقت کے یونان میں معاشرتی بے راہ روی، مرد عورت کے آزادانہ جنسی اختلاط کا والہانہ پن اور سرکاری ایوانوں میں رشوت ستانی، بے ایمانی اور حسد و افتراق کی نشان دہی بار بار کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد میں ہی ایک ممتاز طنز نگار اور نقاد کی صورت میں خاص و عام میں مشہور ہوا۔ والٹیر کا کہنا ہے کہ ''طربیہ وہ ہے جو معاشرہ کی بدکاریوں اور بدحرکتوں کی بولتی تصویر ہو۔'' اس لحاظ سے ارسٹوفینز کے طربیہ ڈراموں کو بہترین طربیہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

□□□

پتہ:
15 - Rawalpora Housing Colony
Srinagar - 190005 (J & K)

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

ابوالکلام

افسانوی ادب کا ترجمہ

افسانہ ایک ایسی تحریر ہے، جس میں جادوئی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ عرف عام میں افسانوی ادب یا افسانہ ایک ایسا فن پارہ ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی ایک جادوئی پہلو موثر طریقے سے موثر زبان و بیان میں موزوں ترکیب و تکنیک کے ساتھ تخلیق کار کے عرفان و انبساط سے گزر کر قارئین کے لیے معرض وجود میں آیا ہو۔ ترجمہ ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل عمل ہے جس کے ذریعے کسی تصنیف کو اس کی اصل زبان سے جملہ خصوصیات کے ساتھ کسی دوسری زبان میں کچھ اس طرح سے منتقل کرنے کا نام ہے جس کے باوصف ترجمے کی زبان میں اصل تصنیف دوبارہ اپنی اصل شکل میں آ جائے۔ تجارت کی طرح مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان بھی تہذیبی لین دین کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ خالص ہے اور اسے کسی دوسری تہذیب میں ایسے عناصر نظر نہیں آتے، جن کی طرف اس نے شوق اور رشک آمیز تجسس کے ساتھ نہ دیکھا ہو۔ تہذیب کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں ادب میں یہ بات زیادہ نمایاں ہوتی ہے کیوں کہ رقص، موسیقی اور مصوری کی نقل اتارنے کے مقابلے میں خیالات کو اپنی زبان اور الفاظ میں ڈھال لینا آسان ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادیب دوسرے ادیب سے وہ چیزیں اپنے یہاں منتقل کر لیتا ہے، جنھیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے ادبی مزاج سے ہم آہنگ پاتا ہے۔

اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمے کا کام تو اردو کی ابتدا ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ کلاسیکی روایت میں تقلیدی زاویۂ نظر کی اہمیت کے تحت ترجموں کی حیثیت بھی تخلیقی فن پاروں کے برابر تھی۔ تاریخی لحاظ سے دیکھیے تو احیاء العلوم کی تحریکوں کے پیچھے یا کسی قوم کے فکری اور شعوری ارتقا میں ہمیں ترجموں کا رول بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ خلافت عباسیہ کے زمانے میں یونانی علوم کے تراجم، یورپی احیاء العلوم کی تحریک کے پس منظر میں اسلامی علوم کے تراجم، یہ دونوں صورتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ فکر و شعور کی بلندی اور تہذیبی تحریک میں ترجمے خاص رول ادا کرتے ہیں۔ خود ہماری زبان میں سرسید کے دور کی فکری فضا میں، بعد ازاں رومانوی دور میں، اور پھر ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ترجمے ہوئے اور بہت ہوئے۔ ان تراجم کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ پورا عہد تہذیبی اور ثقافتی تحریک کا عہد رہا ہے اگرچہ مغربی ادب سے ترجمے انیسویں صدی میں شروع ہوئے۔ ان ترجموں میں بھی مختصر افسانوں کی نوبت بہت دیر میں آئی۔ افسانے کو بعض نقادوں نے ادب اور صحافت کے درمیان کی ایک صنف قرار دیا ہے۔ مختصر اردو افسانے پہلے رسالوں ہی کی زینت بنے۔ لاہور سے مخزن، کانپور سے زمانہ، آگرہ سے نگار، دہلی سے صلائے عام جیسے اہم رسائل نکلنے شروع ہوئے تو بعض یورپی افسانوں کے ترجمے بھی ان میں شائع کیے گئے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ ان کے اثر سے خود اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم اور سعادت حسن منٹو نے طبع زاد افسانے لکھنے سے پہلے ترجموں کی طرف توجہ کی اور منٹو نے اپنے ترجموں کا مجموعہ 'روسی افسانے' کے عنوان سے لاہور سے شائع کیا۔

اگر ان رسالوں کی ورق گردانی کی جائے تو ایسے متعدد افسانے ملیں گے جو مغربی زبانوں سے لیے گئے ہیں اور یا تو انھیں جوں کا توں رکھا گیا ہے یا پھر ہندوستانی لباس پہنایا گیا ہے۔ مشکل ہی سے کسی جگہ یہ معلوم ہوگا کہ یہ ترجمہ کس کا ہے اور کس زبان سے لیا گیا ہے۔ شروع میں سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری نے بھی مختلف زبانوں سے ترجمے کیے۔ تخلیقی عمل کے لیے مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت سے متصف تخلیق کار کو ایک تخلیقی کرب سے گزرنا پڑتا ہے، تب جا کر کہیں آمد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور معیاری ترجمے بالخصوص ادبی ترجمے کو آمد سے چل کر آورد سے ہوتے ہوئے آمد کی شکل و صورت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اسی نوعیت کے ترجمے کو تخلیقی ترجمہ کہا جاتا ہے جس میں زبان و بیان، اسلوب اور فن کی نزاکتوں اور لطافتوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ علوم کا ترجمہ کرتے وقت بھی تخیل کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ تخیل میں پرواز کر کے مماثلات اور بہتر مترادفات تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ افسانوی ادب کے ترجمے کی صورت میں دو مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے مد مقابل ہوتی ہیں۔ ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ہر زبان کا لفظ اپنی اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لفظوں کے مرادفات اور مترادفات کے معنوی فرق کی جھلکیوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے۔ لفظوں کو آپس میں جوڑنے سے جملے کی ساخت بنتی ہے۔ جملے کے الفاظ بعض اوقات ایک دوسرے سے مل کر نئے معنیاتی نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر جملے کا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ پھر جملے آپس میں مل کر اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں۔ بعد ازاں پورے افسانے یا ناول میں ایک فضا کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا۔ جملوں کی ساخت، معنیاتی نظام اور آہنگ نیز اسلوب کی زیریں لہروں کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ مزید برآں وحدت تاثر کی شدت کو بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ایک مزید اہم بات یہ کہ ناول یا افسانے کی تہذیبی فضا کے پیش نظر ایسی موزوں لفظیات سے کام لینا پڑتا ہے جو ترجمے میں پوری فضا کو منتقل کر سکے۔

جب آپ کسی افسانوی فن پارے کا ترجمہ کرنے کے لیے سوچیں تو پہلے آپ اس فن پارے کا متعدد بار مختلف زاویوں سے بغور مطالعہ کریں مشکل الفاظ و اصطلاحات کی فہرست بنائیں۔ ان کے موزوں ترین مرادفات اور مترادفات کے

لیے لغت اور فرہنگ سے رجوع کریں۔ اس کے بعد اس فن پارے کے موضوعات اور تانے بانے پر گہری نگاہ رکھیں۔ اس کے بعد پلاٹ کی تہوں اور پیچیدگیوں تک رسائی حاصل کریں۔ واقعات کے نشیب و فراز اور ان میں شامل کرداروں کی نفسیات اور ان کی قدروں سے بخوبی واقف ہوں۔ ہر کسی افسانوی فن پارے کے واقعاتی پلاٹ کے علاوہ اس کا ایک جغرافیائی پلاٹ بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ان مقامات کے تمام پہلوؤں سے باقاعدہ آگہی ضروری ہے۔ اس لیے کہ مقامات کے بدلتے ہی زبان، بولی، لہجے اور رہن سہن کے طور طریقے بدل جاتے ہیں۔ مزید برآں ان تمام پہلوؤں کو برتنے کے لیے جو زبان، اسلوب اور تکنیک استعمال کی گئی ہے ان کی زیریں لہروں اور رموز کو بڑی تندہی سے سمجھنا اور ترجمے کی زبان میں ان کو ڈھالنا ایک اچھے اور معیاری ترجمے کے لیے لازم ہے، نیز اظہاری جہتوں اور فنی صورتوں اور سیرتوں کے ساتھ ساتھ وحدت تاثر کی شدت کی منتقلی کا اہتمام بھی اشد ضروری ہے۔ نہیں تو ترجمے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

جب ہم کسی افسانوی فن پارے کا ترجمہ کرتے ہیں تو جس طرز اظہار سے وہ متصف ہے اس کے سارے نشیب و فراز سے گزرتے ہیں۔ انھیں ہم اتنا قریب سے دیکھتے ہیں کہ وہ سب کچھ ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ترجمے میں دو تہذیبیں ہی نہیں بلکہ دو مختلف اصناف و روایات بھی ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں۔ دنیا کے بیشتر افسانوی ادب میں مافوق الفطری، اساطیری اور دیومالائی عناصر ضرور پائے جاتے ہیں اور ان کے مطالعے سے انسانی اذہان و قلوب کے آغاز و ارتقا کا پتہ چلتا ہے ساتھ ہی تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے قوموں اور ملکوں کے ارتقا کے مدارج سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور یہ آگہی ہر کس و ناکس کو نہیں ہو سکتی کیوں کہ ہر شخص مختلف زبانیں نہیں جان سکتا ہے۔ عام طور پر دیکھا جائے تو افسانوی ادب کے ترجمے کی مشکلات بھی کم و بیش وہی ہیں جو کسی بھی غیر زبان کی تحریر کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرتے وقت ہوتی ہیں۔ تاہم افسانوی ادب کے تراجم مترجم سے لیے خاص صلاحیتوں کا تقاضا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ محاورے اور فقرے کی سطح کی ذو زبان دانی کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی فنکاروں کا سا تخیل بھی ہو۔ مرزا یگانہ چنگیزی نے اپنی تصنیف آیات وجدانی میں فراق گورکھپوری کے نام ایک خط میں یہ لکھا ہے کہ آپ سوچتے انگریزی میں اور لکھتے اردو میں ہیں۔ مرزا غالب بھی سوچتے فارسی میں اور لکھتے اردو میں۔ اور آج کے زمانے میں لوگ یہی الزام قرۃ العین حیدر پر لگاتے ہیں۔ مرزا یگانہ زبان کے سلسلے میں لکھنوی دبستان کی طہارت پسندی کے قائل تھے۔ انھوں نے اس حیاتیاتی اصول پر غور نہیں کیا کہ طاقت اور حسن دونوں نسلی امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زبانوں پر بھی یہی اصول منطبق ہوتا ہے۔ فراق اور غالب کیا، ہر بڑے شاعر کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اس حیاتیاتی اصول کو اپنی شاعری میں کس حد تک برتتا ہے۔ لہٰذا فراق اور غالب کی جو خاصیت مرزا یگانہ نے بتائی ہے یہی خاصیت مترجم کی بھی ہونی چاہیے۔ یعنی یہ کہ وہ دونوں زبانوں میں سوچ سکے یہی تخلیقی خاصیت مترجم کو اس قابل بناتی ہے کہ افسانوی ادب کا ترجمہ کرتے وقت اپنے تخیل کی مدد سے خود کو دونوں زبانوں میں اسی طرح جذب کر سکے کہ اپنی زبان میں دوسری زبان کی روح اور جسم دونوں کو منتقل کر سکے۔ ظاہر ہے کہ یہاں روح سے مراد معنوی جہتیں اور جسم سے مراد اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ مزید برآں وحدت تاثر کی شدت کا منتقل ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ اس سے زبان کی معنوی اور اظہاری جہتوں میں اضافہ ہوگا نیز اس میں تنوع کے ساتھ ساتھ انفرادیت بھی پیدا ہوگی۔ ترجمہ کرتے وقت اپنی زبان کے محاوروں اور روز مرہ کا خیال رکھنا لازی ہے۔ مگر دوسری زبان سے ترجمہ کرتے وقت اکثر اس زبان کے محاورے اور روز مرہ کے ترجمے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں افسانوی ادب کے ترجمے میں فقروں کے آہنگ اور اسلوب کا ترجمہ بھی ہونا چاہیے اور ناول یا افسانے کی پوری فضا بھی منتقل ہونی چاہیے۔ ایسی ہی صورت میں ترجمہ تخلیقی سطح کا حامل ہو سکتا ہے۔ نتیجتاً ایسے ترجمے میں، کچھ نہ کچھ اجنبیت اور کھردرے پن کا ہونا لازی امر ہے۔

عسکری صاحب نے فلابیر، استندال اور میلوِ ل کو 'قرۃ العین حیدر نے ہنری جیمس کو اور انتظار حسین نے ترگنیف کو اردو میں اس طرح سمویا ہے کہ اردو افسانوی ادب کی فضا ان مختلف رنگوں سے نکھر گئی ہے۔ مترجم کے لیے لازی ہے کہ وہ وسیع مطالعے کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہو اور تخیل کی بلند پرواز رکھتا ہو تاکہ وہ ترجمے کے دوران اصل مصنف کی زبان اور اسلوب کے شانہ بشانہ چل سکے۔ شاہد احمد دہلوی اور خواجہ منظور حسین کو ہم اسی زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے معروف فنکاروں کو ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہ الفاظ دیگر افسانوی ادب کا ترجمہ، فن افسانہ نگاری کی کس ضرورت کو پورا کرتا ہے، ایک سامنے کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ ادب کے تراجم سے فنکار کی اپنی زبان میں ایسی ادبی فضا پیدا ہوتی ہے جسے خود فنکار قائم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن تخلیقی فنکار دوسری زبان کے لفظوں کے جادو کو بھی اپنی لفظیات میں جگانا چاہتا ہے۔ فقروں کی ساخت اور اسلوب کے جوہر کو منتقل کرتے وقت وہ خود اپنی زبان کو نئے معنی و آہنگ، نئی وسعتوں، اظہار کی نئی صورتوں اور جدید افسانوی فضاؤں سے آشنا کرتا ہے۔ تراجم کے ذیل میں سب سے بڑا مسئلہ وہ ذہنی رویہ ہے جو ترجموں کو ذہنی اختراع کے مقابلے میں ثانوی حیثیت عطا کرتا ہے اور یہ صورت حال رومانوی تحریک سے پیدا ہوئی جس نے ذہنی اختراع کو تراجم کے مقابلے میں ثانوی درجے کا ذہنی عمل قرار دیا، ہنوز یہ تصور عام ہے کہ ترجمہ نگاری میں اختراع ذہن کا کوئی عمل دخل نہیں یہی وجہ ہے کہ ترجمے کی حیثیت تخلیقی فن پاروں کے برابر نہیں۔ □□□

پتہ:
Deptt. of Translation
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad (A.P.)

عابد سورتی

(گجراتی کہانی)

نابینا

لوک ناتھ سورج کے ساتھ جاگ کر نل کے نیچے نہانے بیٹھا اور ٹھنڈے پانی کی دھار اس کے جسم پر پڑی تو اسے یاد آگیا، رات میں اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ٹھنڈے پانی اور خوابوں کے درمیان کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ نابینا لوگ خواب دیکھ سکتے ہوں گے یا نہیں۔ لیکن اُسے یہ بخوبی معلوم تھا کہ وہ پیدائشی اندھا نہیں تھا۔ دس سال کی عمر تک اُس نے جو کچھ بھی دیکھا تھا، اُس میں سے وہ شاید ہی کچھ بھول پایا تھا، مثلاً کوئل۔ آج بھی وہ جب بھی کوئل کی کوک سنتا، بچپن کی وہی کوئل کی تصویر اُس کے ذہن میں ابھر آتی تھی۔ غسل کرنے کے بعد اس نے پوجا پاٹھ بھی مکمل کیا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اسی معمول کا تیسرا کام ناشتہ تھا۔ کمر پر گمچھا باندھ پالتھی مار کر وہ رسوئی میں ماں کے سامنے بیٹھا اور خواب کا ذکر کیا۔

ماں نے ناشتے کی تھالی کے ساتھ چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے پوچھا، ''کیا دیکھا خواب میں؟''

''شنکر جی!'' وہ بولا، ''کہہ رہے تھے — لوک ناتھ ہم تمھیں ایک منٹ کا وقت دیتے ہیں، تم جو مانگو گے وہ مل جائے گا۔''

''سچ!'' ماں چہک اٹھی، ''پھر تو نے کیا مانگا؟''

''میں سوچتا رہ گیا اور منٹ بیت گیا!''

''ارے پاگل!'' انجانے اپنی آواز میں دکھ گھولتے ہوئے ماں نے کہا، ''کم از کم اپنی آنکھیں ہی مانگ لی ہوتیں۔''

''تب بھولے ناتھ کی نظروں میں میں گر نہ جاتا'' وہ بولا۔ ''وہ کیا سوچتے؟ یہ لوک ناتھ کیسا خود غرض انسان ہے۔ سارا جگ دکھیارا ہے اور اپنے لیے یہ خوشیاں مانگ رہا ہے۔''

اس کا جواب سن کر ماں حیران نہ ہوئی وہ جانتی تھی، اپنی کوکھ سے اس نے بیٹے کو نہیں، کسی سنت کو جنم دیا تھا۔ ویسے لوک ناتھ نہ کوئی سنت تھا نہ مہاتما۔ بلکہ اس ملک کے لاکھوں نابیناؤں میں سے ایک تھا، لیکن پھر بھی الگ۔ الگ اس معنی میں کہ اس کے سامنے کوئی راہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ راہ بنانا جانتا تھا۔

سفید شرٹ پینٹ میں وہ تیار ہو کر جانے لگا تو ماں نے اس کے ہاتھ میں چھڑی تھماتے ہوئے ٹوکا، ''آج پھر بھول گیا۔''

وہ بھولا نہیں تھا۔ ماں کا دل رکھنے کے لیے اس نے چھڑی کا سہارا لیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ اس کی اسٹیل کی یہ چھڑی بھی عام چھڑیوں سے الگ تھی، کیونکہ یہ چار حصوں میں منقسم تھی۔ ضرورت نہ ہونے پر اسے موڑ کر جیب میں رکھا جاسکتا تھا۔ فٹ پاتھ پر قدم رکھ اس نے ویسا ہی کیا۔ چھڑی موڑ کر جیب میں رکھی اور جیب سے کالا چشمہ نکال آنکھوں پر لگا لیا۔

ملا کی دوڑ مسجد تک، یہ کہاوت لوک ناتھ پر بالکل موزوں لگتی تھی۔ اس کی زندگی کا دائرہ بھی محدود تھا۔ گھر سے چوراہا اور چوراہے سے گھر۔ چوراہے پر اس کا اپنا ٹیلی فون بوتھ تھا۔ اس کے کان یہاں کے شور سے مانوس تھے۔

اجلے کپڑے اور چمڑے کے جوتوں میں اسے بغیر چھڑی کے فٹ پاتھ پر قدم بڑھاتا دیکھ شاید ہی کوئی سوچ سکے کہ وہ نابینا ہوگا۔ عام آدمی کے لیے یہ جاننا بھی مشکل تھا کہ اس کی اپنی کچھ گنتیاں تھیں۔ کتنے قدم چلنے کے بعد اسے راستہ پار کرنا ہے اور جوتے پالش کروانے کے لیے کتنے قدم پر رکنا ہے۔

سیدھے فٹ پاتھ پر کچھ فاصلہ طے کر وہ رکا تو ایک بچے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، ''انکل، ہمیں راستہ پار کروا دو نا۔'' اس نے آواز کی سمت میں ہاتھ بڑھایا۔ بچے نے اس کی انگلی تھام لی۔

جہاں لوک ناتھ کھڑا تھا، وہاں نہ کراسنگ تھا نہ زیبرا لائنیں۔ لیکن جب دور کے چوراہے پر لال بتی چمک اٹھتی تھی، ساری سواریاں وہیں رک جاتی تھیں اور چند لمحوں کے لیے سڑک سونی ہو جاتی تھی۔

کچھ منٹوں کے انتظار کے بعد وہ بچے کے ساتھ راستہ پار کر گیا۔ ''تھینک یو انکل!'' بچے نے جانے سے قبل کہا۔ وہ صرف مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ سامنے کے فٹ پاتھ پر سے چوراہے کی جانب قدم بڑھا رہا تھا کہ اس کی ناک نے مہک کو پہچان لیا۔ وہ پھول والوں کی دکان تک آ پہنچا تھا۔ آج اس نے لمبی ڈنڈی والا گلاب خریدا اور شفاف کاغذ میں پیک کرا لیا۔ یہاں سے تینتیس قدم پر جوتے پالش کرنے والا چھوکرا بیٹھتا تھا۔ لوک ناتھ ٹھیک وہیں پر رکا۔ بعد ازاں لوک ناتھ چوراہے پر آیا اور جیب سے چابی نکال اس نے اپنے بوتھ کے تالے میں گھمائی۔ اس ٹیلی فون بوتھ کے لیے وہ نگر پالیکا اور ممبئی شہر کے بھلے انسانوں کا ممنون تھا۔ چونکہ ان کی بدولت ہی اس کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہوا تھا۔

ابھی بوتھ میں وہ میز کرسی جھاڑ کر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان پر لگایا، غلط نمبر تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے کہا، ''جی نہیں، یہ قبرستان نہیں ہے، لوک ناتھ ورما ٹیلی فون بوتھ ہے۔''

دن بھر میں ایسے دس بارہ کالس آ ہی جاتے تھے۔ کبھی کسی میٹرنٹی ہوم کا نمبر یہاں لگ جاتا تھا تو کبھی کسی پولس اسٹیشن کا۔ کبھی کسی ''ملکاڈین'' کی لائن یہاں آ جاتی تھی تو کبھی کسی ہوٹل کی۔ وہ ذرا بھی ناراض ہوئے بغیر سبھی کو پیار

سے جواب دیتا تھا۔

''کیا میں فون کر سکتا ہوں؟''

آواز کسی نوجوان کی تھی۔ اس نے اشارے سے ''ہاں'' کہا۔

بوتھ کے باہر کھڑے نوجوان کے بارے میں سوچنے پر اسے لگا کہ نوجوان میں خود اعتمادی کم ہے، ورنہ جو سہولت عوام کے لیے میسر ہو اس کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''انٹرویو آج ہے'' نوجوان فون پر کسی سے کہہ رہا تھا،'' آپ نے دو ہفتے پہلے خط بھیجا ہوگا لیکن مجھے نہیں ملا.... جی ابھی؟..... یہاں سے آنے میں مجھے گھنٹہ بھر لگ جائے گا...... جی ہاں، میں ٹیکسی کر لوں گا۔''

فوراً ریسیور رکھ اس نے جیب ٹٹولی اور روپے کا ایک سکہ نکال کر لوک ناتھ کے ہاتھ میں رکھا۔ لوک ناتھ نے اس کے سامنے رومال بڑھایا۔ جانے انجانے اس کا رومال قبول کر نوجوان نے پسینہ پونچھا اور اچانک اسے خیال آیا— اس اندھے کو کیسے پتہ چلا کہ اس کا چہرہ گیلا ہے؟ رومال واپس کرتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا۔ لوک ناتھ ریسیور پونچھتے ہوئے صرف مسکرایا۔ چاہتا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ پسینے سے روپے کا سکہ چپ چپا تھا۔ یہ ریسیور بھی گیلا ہے۔

نوجوان اس کے شرارتی مسکان بھرے چہرے کو گھور کر وہاں سے کھسک گیا، تو کچھ پل پہلے آکر اس کے پیچھے کھڑے ایک موچھڑو نے ریسیور اٹھا لیا۔ پھر نمبر ملا کر فون پر کسی سے بات کرنے لگا،'' میں جگا سے بات کر سکتا ہوں جی؟''

لوک ناتھ نے سوچا، یہ کوئی دھاکڑ شخص ہونا چاہیے۔ عام طور پر لوگ ریسیور اٹھانے سے پہلے اتنا ضرور کہتے تھے— فون لگاتا ہے یا لگاتا ہوں۔ اس پٹھے نے اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

''کون، جگا!'' دوسرے سرے پر دوست کے آنے پر موچھڑو نے بات شروع کی،'' ہاں جی.... ہاں جی...... ابھی نہیں...... ہاں جی.....ایک ہفتہ اور رکنا ہوگا......کسی عیش کرو پاپے.....''

منٹ بھر میں بات ختم کر موچھڑو نے بٹوے سے بیس روپے کا ایک نوٹ نکال کر لوک ناتھ کے سامنے رکھا،'' لو جی!'' لوک ناتھ نے نوٹ کے نئے پن کو محسوس کر دراز سے چار نوٹ نکالے، دس اور پانچ روپے کے ایک ایک دو روپے کے دو نوٹ۔ جبھی اس کے کانوں سے سینڈل کی مانوس آواز ٹکرائی۔

موچھڑو کو انیس روپے لوٹاتے ہوئے اس نے میٹھی آواز میں کہا،'' ہیلو۔''

موچھڑو چونکا،'' مجھ سے کچھ کہا جی؟''

''نہیں!'' وہ بولا،'' آپ کے پیچھے جو مس کھڑی ہیں، اس سے۔''

موچھڑو نے پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ واقعی اس کے سامنے اٹھارہ سال کی ایک خوبصورت پونم کھڑی تھی۔ اس نے پھر ایک بار لوک ناتھ کی طرف دیکھا (کہیں یہ اندھا ڈھونگی تو نہیں؟) اور اپنی چوڑی گردن ایک انگلی سے کھجاتا ہوا چلتا بنا۔

پونم اب لوک ناتھ کے سامنے آئی،'' لوکو، میرا کوئی فون تھا؟''

اس نے ''نا'' کہا۔ وہ بوتھ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ پونم باہر کھڑی تھی۔ پل بھر وہ کچھ سوچتی کھڑی رہی۔ پھر بوتھ کے باہر رکھے ہوئے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ یہ اس کے لنچ کا وقت تھا۔ روزانہ وہ اسی وقت (ایک بج کر دس منٹ پر) اپنا لنچ باکس اور پانی کی بوتل لے کر یہاں چلی آتی تھی۔

'' کچھ لوگے؟'' لنچ باکس کھول کر اس نے لوک ناتھ کی جانب اپنا چہرہ گھمایا،'' پوری بھاجی کے ساتھ کیک کا ایک ٹکڑا بھی ہے۔''

''تھینکس مس!'' کچھ پل رک کر اس نے پوچھا:'' آپ کسی دفتر میں کام کرتی ہیں؟''

'' ریڈی میڈ کپڑے بنانے والی ایک کمپنی میں میں پی ایس ہوں۔''

'' تو وہاں فون بھی ہوگا؟''

پونم اس کا اشارہ سمجھ گئی،'' تم یہی پوچھنا چاہتے ہو نا کہ میں اپنے پرسنل کالس وہاں کیوں نہیں ریسیو کرتی؟''

اس نے سر ہلا دیا۔

''میرے اصول!'' پونم کھانا کھاتے ہوئے جواب بھی دیتی جارہی تھی،'' جس وقت کے لیے مجھے تنخواہ ملتی ہو، وہ وقت میرا نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے دوست احباب، گھر والوں کو صاف صاف منع کر دیا ہے دفتر میں مجھے فون نہ کریں۔ البتہ ایمرجنسی ہو تو بات اور ہے۔''

'' یہ بات تو سمجھ میں آئی لیکن.....''

'' لیکن کیا؟''

'' فارگیٹ اِٹ۔ آپ سوچیں گی، انگلی دی تو پہنچا پکڑ لیا۔''

'' مجھے اتنا بھروسہ ہے۔'' کھانا ختم کر پانی کی بوتل کھولتے ہوئے پونم بولی،'' تم ان مردوں میں سے نہیں ہو۔ کہو، تمہارا دوسرا سوال کیا ہے؟''

'' یہی کہ روزانہ فون کا انتظار کرنے کے بجائے آپ خود بھی تو ڈائل کر سکتی ہیں۔''

'' یہ ممکن نہیں۔ میرا بوائے فرینڈ ٹریولنگ سیلز مین ہے۔'' پانی کے دو گھونٹ بھر کر اس نے آگے کہا،'' وہ کسی بھی وقت، کہیں بھی ہو سکتا ہے۔''

فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ پانی کی بوتل اور خالی لنچ باکس اسٹول پر رکھ کر اس نے ریسیور اٹھایا۔ کال اس کے بوائے فرینڈ کی ہی تھی۔

'' ہیلو، راہل!'' وہ چہک اٹھی،'' کہاں سے بول رہے ہو؟''

'' ایر پورٹ؟''

'' پیار کا پنڈ چھڑا کر کہیں بھاگ نکلنے کا ارادہ تو نہیں؟''

'' ہے!'' ریسیور میں سے آواز ابھری،'' لیکن اس میں ایک خطرہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تم سے جتنا دور جاتا ہوں، اتنا ہی اور قریب آتا ہوں۔''

پونم ہنس دی۔''ایسی میٹھی میٹھی باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ اچھا یہ بتاؤ آج شام کو ہم کہاں مل رہے ہیں؟''

''اگر تم نے منی اسکرٹ پہنا ہے تو کسی ڈسکو میں، ساڑی میں ہو تو کسی ریستراں میں اور کوئی اندھا بھی بتا سکتا ہے کہ تم نے ساڑی پہن رکھی ہے۔ کافی ہاؤس کیسا رہے گا؟''

''چھ بجے میں وہیں تمھارا انتظار کروں گی۔''

ریسیور کریڈل پر رکھ اس نے لوک ناتھ کا احسان مانا اور اسٹول پر سے لنچ باکس دیا پانی کی بوتل اٹھالی۔''لوکو' جانے سے پہلے اس نے کچھ سوچ کر پوچھا، ''ساڑی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟''

''ساڑی ہندوستانی عورت کی پہچان ہے۔'' کہتے ہوئے لوک ناتھ کھڑا ہوگیا۔ شفاف کاغذ میں لپٹا ہوا گلاب کا پھول اس کے ہاتھ میں تھا۔'' اور دوسری پہچان ہے یہ۔ میری طرف سے راہل کو یہ چھوٹا سا تحفہ دے کر کہنا کہ اندھا یہ بھی بتا سکتا ہے کہ آج اس نے کیا پہنا ہوگا۔''

پونم کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں،''کیا پہنا ہوگا؟''

''شرٹ، پینٹ اور ٹائی،'' پونم کچھ آگے کہے اس سے پہلے اس نے وضاحت کردی،'' سیلزمینوں کے لباس یہی ہوتے ہیں۔''

پونم سے ہنسے بغیر رہا نہ گیا۔

اس کی ہنسی لوک ناتھ کی ہنسی تھی۔ اس کی خوشی لوک ناتھ کی خوشی تھی۔ مانو اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اپنے قریب آنے والے ہر شخص کے دل کو مسکراہٹوں سے بھر دینا۔ پھر وہ شخص چھوٹا ہو یا بڑا، اونچا ہو یا نچا، امیر ہو یا غریب، اس کے لیے اس دنیا میں سبھی برابر تھے۔

تین دن بعد جب وہ اپنے جوتے پالش کرانے کے لیے رکا تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ چھوکرے نے موضوع ہی کچھ ایسا چھیڑا تھا۔

''صاحب! گل قند خریدو گے؟''

''اپن نے بنانا سیکھ لیا ہے۔'' لوک ناتھ کے جوتے چمکاتے ہوئے وہ فخر سے کہہ رہا تھا،'' ایک دم ایزی ہے۔ ایک ہاتھ میں گلاب کی پتیاں اور دوسرے ہاتھ میں چینی لے کر مسلنے سے جو ملیدہ تیار ہوگا، اسے کانچ کے مرتبان میں بھر کر دھوپ میں رکھ دو اور گل قند تیار۔''

''مرتبان دھوپ میں کتنے گھنٹے رکھنا چاہیے؟''

''میں نے دو دن رکھ کر بوتلوں میں بھر لیا تھا۔ صاحب، آپ یوہی کریں گے تو شام تک میری دسوں بوتلیں بک جائیں گی۔''

''اوکے!'' بٹوے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ مسکرایا،'' کیا دام رکھے ہیں؟''

''ایک بوتل کے صرف چھ روپے۔''

''میں دو بوتلیں خریدوں گا۔''

اب تک چھوکرے نے جوتے پالش کر لیے تھے۔

''بازار میں یہ چھوٹی بوتل گیارہ روپے میں بکتی ہے۔ میں چھ روپے میں بیچتا ہوں، پھر بھی ایک روپیہ بچتا ہے۔''

دو بوتلوں کی قیمت ادا کر لوک ناتھ نے بٹوہ جیب میں کھسکا دیا۔ دس منٹ بعد وہ اپنے ٹیلی فون بوتھ میں بیٹھا تھا اور باہر اسٹول پر ایک اکھڑ سا انسپکٹر۔ صبح صبح اچانک ٹیلی فون ڈیڈ ہو جانے کی وجہ سے آج بہتوں کو مایوس ہونے والی تھی۔ لیکن انسپکٹر گوڈبولے کی کئی پریشانیاں تھیں۔

''آج کا دن ہی کچھ منحوس شروع ہوا۔'' وہ اپنی وردی کا ایک تازہ داغ کاغذ کے ٹکڑے سے صاف کر رہا تھا۔ صبح چائے کی پہلی پیالی کے ساتھ بیوی نے ٹائیں ٹائیں شروع کردی۔ تنگ آ کر گھر سے نکلا تو بیوی راستہ کاٹ گئی۔ یہاں فون کو چھوا تو یہ ڈیڈ ہوگیا۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے پیڑ پر بیٹھے کوے پر ایک نظر ڈالی،'' یہی کیا کم تھا کہ کوے نے وردی خراب کردی۔''

''آپ ڈیوٹی پر لیٹ ہوں گے تو بڑے صاحب کی......''

''ڈانٹ پھٹکار پچھلے ایک پکھواڑے سے سن رہا ہوں۔'' لوک ناتھ کا جملہ اس نے درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے بتایا،'' اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔''

''کوئی نئے صاحب آئے ہوں گے؟''

''چیف تو وہی ہے۔ ان کو اوپر سے جوتا پڑتا ہے تو وہ نیچے والوں پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔ ویسے قصور ان کا بھی نہیں ہے۔'' کاغذ کا گندا ٹکڑا پھینک کر اس نے لوک ناتھ سے سوال کیا،'' میں نے تمھیں بینک ریڈ کے بارے میں بتایا تھا؟''

''وہ تو قریب بیس دن پہلے کی بات ہے۔''

''وہی۔'' وہ بول اٹھا،'' ان لٹیروں کا اب تک پتہ نہ چل سکا ہے نہ ہی ان کا کوئی سراغ ملا ہے۔ ہمارے کتے بھی فیل ہوگئے۔ ہم تو صرف انسان ہیں۔ کیا کریں؟ اب تک وہ پنچھے سرحد سے باہر نکل گئے ہوں گے۔''

کچھ سوچ کر لوک ناتھ نے آہستہ سے پوچھا،'' بینک سے نوٹوں کے جو بنڈل غائب ہوئے ہیں ان کے بارے میں کیا آپ کو معلوم ہے؟''

یہ کوئی معمولی سوال نہ تھا۔ گوڈبولے کا چونکنا بھی واجب تھا۔'' تمھیں کیا جاننا ہے؟''

''وہ بنڈل سو کے تھے، پچاس کے تھے یا دس بیس کے؟''

''دو لاکھ روپے کے بنڈل سو سو کے تھے۔'' لوک ناتھ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے بتایا،'' باقی بیس بیس کے۔''

''سارے نوٹ نئے ہوں گے؟''

''بالکل!''

دراز سے بیس روپے کا ایک نوٹ نکال کر لوک ناتھ کھڑا ہوگیا،'' کہیں یہ انھیں میں سے تو ایک نہیں؟''

اس کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹتے ہوئے گوڈبولے نے کچھ پل اسے غور سے

دیکھا۔ پھر اپنی ڈائری نکال سیریل نمبر چیک کیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں،

''یار لوکو، یہ اسی میں سے ایک ہے۔'' بولتے ہوئے وہ بھی اسٹول سے کھڑا ہو گیا، ''یہ تمھارے پاس کہاں سے آیا؟''

''پچھلے کچھ دنوں سے ایک صاحب یہاں فون کرنے آتے ہیں اور ہمیشہ بیس کا نیا نوٹ دے جاتے ہیں۔''

ڈائری پر بال پین جھکاتے ہوئے اس نے پھر سوال کیا، ''ان کے بارے میں کچھ اور بتا سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں! ان کی اونچائی ساڑھے پانچ فٹ ہونی چاہیے۔''

''وہ کیسے؟''

''جب وہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں تو ان کی آواز بالکل میرے سامنے سے آتی ہے اور میری اونچائی اتنی ہی ہے۔''

گوڈبولے نے اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے ہوئے کہا، ''اور؟''

''وہ شمالی ہندوستان کے رہنے والے ہونے چاہیے۔''

''یو۔پی کے؟''

''شاید پنجاب کے۔''

''تمھیں یقین ہے؟''

''ان کے بات کرنے کا لہجہ ویسا ہی ہے اور ہاں.....'' یکبارگی یاد آنے پر اس نے جوڑا، ''وہ لوگ ابھی اتوار تک اسی شہر میں رہیں گے۔''

''سورداس!'' گوڈبولے نے اپنی ڈائری بند کر جیب میں ڈالتے ہوئے مستی میں کہا، ''لگتا ہے تم نے میرا دن ہی نہیں سال بھی سدھار دیا۔''

لوک ناتھ نے میٹھی آواز میں کہا، ''ہیلو!''

انسپکٹر گوڈبولے چونکا، لیکن وہ کچھ سمجھے اس سے پہلے اس کے پیچھے اتنی ہی میٹھی آواز ابھری، ''ہیلو.....لوکو!''

وہ پونم تھی۔ دونوں کو حیرت سے دیکھتا ہوا انسپکٹر وہاں سے کھسک گیا۔

''مس!'' لوک ناتھ نے طنز سے کہا، ''بہتر ہوگا کہ آج آپ لوٹ جائیں۔ آج آپ کا فون نہیں آئے گا۔''

وہ ٹھٹک گئی، ''تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

یہ تو سارا جگ جانتا ہے کہ بابا لوک ناتھ ترکال گیانی ہیں۔''

اب پونم کی نگاہ ''آؤٹ آف آرڈر'' نوٹس پر پڑی اور اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔ ''بابا!'' اسٹول پر بیٹھ کر اپنا لنچ باکس کھولتے ہوئے اس نے مذاق جاری رکھا، ''کیا آپ ہمارا بھوشیہ بتا سکتے ہیں؟''

''اوشیہ! کیا جاننا ہے تمھیں بچی؟''

''راہل سے ہماری شادی کب ہوگی؟''

''سوال یہ نہیں ہے کہ شادی کب ہوگی، بچی؟''

''پھر!''

''سوال یہ ہے کہ شادی ہوگی یا نہیں؟''

پونم کے گلے میں جیسے مچھلی کا کانٹا پھنس گیا ہو ایسے میں اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی ویسے بولنے کے لیے اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو کچھ وہ بتانا چاہتی تھی۔ وہ بھی لوک ناتھ نے بھانپ لیا تھا، مانو اس کے دل کی گہرائی میں غوطہ لگا کر وہ اس کا خوف کنارے تک لے آیا تھا۔

''دیکھیے مس!'' اب لوک ناتھ نے سنجیدگی سے کہا، ''آپ میری دوست ہیں اور اس کا مجھے فخر ہے۔'' پونم کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اگر آپ بھی مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں تو یہ آپ کا فرض بنتا ہے کہ آپ اپنا مسئلہ کھل کر میرے سامنے رکھیں تاکہ ہم ساتھ مل کر اسے سلجھا سکیں۔''

وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ لوک ناتھ کو اس کی بھنک لگ ہی گئی۔ دوسرے پل اس نے اپنا رومال بڑھا دیا۔ پونم نے اپنا چہرہ پونچھا اور لنچ باکس کھائے بغیر بند کر دیا۔

''یہ فون کب ٹھیک ہوگا؟''

''شکایت جیسے لکھوائی تھی۔ کسی بھی وقت ٹھیک ہو سکتا ہے۔''

''وہ کھڑی ہوگئی،'' تب گھر جانے سے پہلے شام کو میں یہاں سے ہو کر جاؤں گی۔''

انسپکٹر گوڈبولے لوک ناتھ سے الگ ہو کر سڑک پار کر ایک مکان کے گلیارے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تیکھی نظر ٹیلی فون بوتھ پر لگی تھی۔ جو بھی شخص فون کرنے آتا، اسے وہ غور سے دیکھتا تھا۔

پونم کے جانے کے بعد دو مرد اور آئے۔ ان میں ایک بونا تھا جو اسٹول پر چڑھ کر نمبر گھمانے جا رہا تھا کہ لوک ناتھ نے ''آؤٹ آف آرڈر'' نوٹس کی جانب اشارہ کیا۔ شاید وہ دونوں کسی سرکس میں کام کرتے تھے۔ اس کا دوسرا ساتھی تاڑ کی طرح لمبا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹیلی فون بوتھ کے سامنے ایک ٹیکسی رکی اور ایک نوجوان بریف کیس کے ساتھ باہر نکلا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ نوٹس پر پڑی اور پھر لوک ناتھ کے چہرے پر۔

''لوک ناتھ تمھیں ہو؟'' کچھ قدم چل کر سامنے آتے ہوئے اس نے پوچھا۔

لوک ناتھ نے ''ہاں'' میں سر ہلا دیا۔

''میرا نام.....''

''میں جانتا ہوں!'' اس نے مسکرا کر کہا، ''آپ راہل ہیں۔''

راہل کو واقعی حیرانی ہوئی۔ آج تک پونم سے وہ لوک ناتھ کے بارے میں قصے سنتا آیا تھا۔ یہی نہیں، آخری ملاقات کے وقت پونم نے ایک عجیب جملہ بھی کہا تھا۔ ''لوکو'' اندھا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ نہیں دیکھتا۔''

راہل چکرا گیا تھا۔ یہ جملہ نہیں تھا، ''روبک کیوب'' تھا۔ اس نے الگ الگ ڈھنگ سے توڑ کر جوڑ کر موڑ کر دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ اسوقت اس کے معنی سمجھ نہیں سکا تھا۔ آج لوک ناتھ سے سامنا ہونے پر اس کی گتھی سلجھ گئی۔ لوک

ناتھ کی آنکھوں میں بھلے ہی روشنی نہ ہو، وہ آوازوں کے ذریعے، لمس اور بو کے ذریعے دیکھتا تھا۔

''کہیے!'' لوک ناتھ نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا، ''میں آپ کی کیا سیوا کرسکتا ہوں؟''

''پونم کو ایک میسیج دوگے؟''

''ضرور!''

''اس سے کہنا کہ آج شام کو میں اس علاقے میں رہوں گا اور چھ بجے غلو کے چائنیز ریستراں میں ملوں گا۔''

''اب ایک گذارش میری ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے دراز میں رکھی دو بوتلوں میں سے ایک نکال کر راہل کو دی۔

''یہ کیا ہے؟''

''گل قند!'' وہ بولا، ''میری طرف سے مس کو یہ تحفہ دینا۔ اس کے روزانہ استعمال سے ان کی آواز میں بھی آپ جیسی چاشنی گھل جائے گی۔''

راہل نے بوتل قبول کرنے سے پہلے پوچھ لیا، ''تم خود بھی اسے دے سکتے ہو۔''

''شاید وہ قبول نہ کریں۔ وہ جب یہاں بیٹھ کر بیچ لیتی ہیں تب میں بھی ان کی دعوت قبول نہیں کرتا۔'' وجہ بتاتے ہوئے اس نے جوڑا، ''لیکن آپ اپنے ہاتھوں سے دیں گے تو مس نا نہیں کہیں گی۔''

راہل کے چہرے پر انجانے ہی مسکان پھیل گئی۔ اسی مسکان کے ساتھ وہ انتظار کرتی ٹیکسی میں بیٹھا اور چوراہے کی سواریوں کی بھیڑ میں کھو گیا۔

لوک ناتھ اپنی کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے ایک مانوس سی آواز سنی، ''فون ڈیڈ ہے، جی؟''

'صبح سے!'' کہتے ہوئے اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ چوکنا ہوگیا۔ موہتھرا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

سڑک پار مکان کے گلیارے میں چھپ کر کھڑا انسپکٹر گوڈبولے بھی محتاط ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ وہ موہتھرا بینک لٹیرا ہوسکتا ہے۔ لوک ناتھ کے بتائے حلیے کے مطابق وہ کسی پنجابی ٹرک ڈرائیور سا لگتا تھا۔ اس کی اونچائی بھی قریب ساڑھے پانچ فٹ تھی۔ لیکن ابھی مطمئن ہونا باقی تھا۔

''یہاں کہیں اور پبلک فون ہوگا؟''

''آپ اس شہر میں نئے لگتے ہیں؟'' موہتھرا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لوک ناتھ نے بتایا، ''ورنہ آپ کو ضرور پتہ ہوتا کہ یہاں قریب میں ہی ایک اور فون ہے۔''

''کہاں ہے جی؟''

''اس سامنے والے مکان کے گلیارے میں۔''

موہتھرا بوتھ سے مڑا اور لوک ناتھ نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا۔ انسپکٹر گوڈبولے کے لیے یہ اشارہ تھا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اب اسے مکان کے گلیارے سے نکل کر موہتھرا کا پیچھا کرنا تھا، مناسب موقع ملتے پر دھر دبوچنا تھا۔ لیکن وہ گلیارے سے نکل نہ پایا۔ موہتھرا اسی کی جانب آرہا تھا۔

وہ بوکھلا گیا۔ اندھے نے ایسا کیا چمتکار کردیا کہ شکار خود چل کر شکاری کے جال میں چلا آرہا تھا۔ سڑک پار کرتے ہی موہتھرا مکان کے گلیارے میں داخل ہوا کہ انسپکٹر گوڈبولے نے اپنی ریوالور نکال کر اس کے سینے پر تان دیا۔

اس رات لوک ناتھ چین کی نیند نہیں سوسکا۔ اس کا مسئلہ یہ نہ تھا کہ اب تک موہتھرا کا گینگ پولس کے چنگل میں پھنس کر سلاخوں کے پیچھے چلا گیا ہوگا کہ نہیں، بلکہ اس کا درد یہ تھا کہ پونم اور راہل کے رشتے میں کہیں دراڑ تو نہیں پڑی ہوگی۔

اب پونم میں اتنی ہمت آگئی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے حقائق کو راہل کے سامنے رکھ سکے۔ لیکن اس حوصلے کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ لوک ناتھ کی سوچ سے پرے تھا۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا— سچ کبھی ہارتا بھی ہے تو اس کا سر اونچا ہوتا ہے۔

گھڑی نے رات کے بارہ بجائے اور لوک ناتھ کی ماں نے کروٹ بدل کر دیکھا تو لوک ناتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے سوچا، بیٹا شاید باتھ روم میں گیا ہوگا یا پانی پینے اٹھا ہوگا۔ تھوڑی دیر تک وہ آہٹ لیتی پڑی رہی تھی۔ کہیں کوئی ہلچل سنائی نہ دینے پر وہ اٹھ بیٹھی۔

لوک ناتھ ایک کونے میں رکھی شوجی کی مورتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کچھ پلوں کے لیے ماں اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا تو پوچھ لیا، ''کیا بات ہے بیٹا؟''

اب تک لوک ناتھ اپنی پرارتھنا پوری کرچکا تھا۔ ''ماں؟'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا، ''آج پہلی بار دل میں کھٹکا ہوا ہے، کہیں رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔''

''کیسا رشتہ؟''

''پیار کا۔'' وہ ماں کے قریب بیٹھ گیا، ''دونوں بہت ہی بھلے ہیں۔ ایک دوسرے کو سچے دل سے چاہتے ہیں۔''

''کون ہیں وہ دونوں؟''

''آپ نہیں جانتیں!'' اس نے کچھ رک کر کہا، ''ویسے میں بھی انھیں ٹھیک سے نہیں جانتا۔''

''تو پگلا کا پگلا ہی رہے گا۔'' ماں ہنس دی، ''چل، اب سو جا۔''

دوسرے دن صبح لوک ناتھ پھول والے کی دوکان پر رکا نہ ہی اپنے جوتے پالش کرائے۔ وہ سیدھا چوراہے پر پہنچا اور ٹیلی فون بوتھ کھول اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کل شام کو نگم کے لوگ فون ٹھیک کرگئے تھے۔ لیکن ''آؤٹ آف آرڈر'' کا بورڈ اب بھی بوتھ کے باہر لٹک رہا تھا۔ یاد آنے پر اس نے وہ نکال کر اندر ایک

طرف رکھ دیا۔

ٹھیک ایک بج کر دس منٹ پر پونم آئی۔ روز آنے کا اس کا یہی وقت تھا۔ لیکن روز کی طرح وہ بھی آج اپنا اخلاقی رسم بھول گئی۔ لوک ناتھ سے اس نے نہ ''ہیلو'' کہا نہ کچھ اور۔ اور اسٹول پر بیٹھ گئی۔

آخر لوک ناتھ ہی شروع ہوا، ''مس......!''

''جی!''

''کل کی ملاقات کیسی رہی؟''

''ٹھیک۔''

''سب کچھ سچ بتا دیا؟''

''ہاں!''

''کیا کہا اس نے؟''

''سوچنے کے لیے ایک رات مانگی۔''

''کیا سوچنے کے لیے؟''

''یہی کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا یا نہیں؟''

خاموشی غالب ہو اس سے قبل لوک ناتھ نے موضوع بدل دیا۔ ''اب تک آپ نے کھانے کا ڈبہ نہیں کھولا۔''

''بھوک نہیں ہے!''

''کل قند چکھا؟''

اس کے سوال کو نظر انداز کر پونم نے اس کی طرف دیکھا، ''تمھیں کیا لگتا ہے؟''

''ایک آدھ دن میں بارش شروع ہونی چاہیے۔''

''میں نے موسم کے بارے میں نہیں، اپنی شادی کے بارے میں پوچھا ہے۔''

''لڑکا برا نہیں ہے۔''

''لوکو!'' وہ بھڑک گئی۔ تبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فوراً کھڑے ہوتے ہوئے ریسیور اچک لیا۔ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ بے صبری اس کے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی۔

''ہیلو...... ہیلو......'' وہ بول اٹھی اور دوسرے پل اسے پتہ چلا، فون راہل کا نہیں تھا۔ ''ساری، رانگ نمبر...... جی نہیں یہ قبرستان نہیں ہے۔'' اس نے ریسیور پٹک دیا۔

لوک ناتھ نے اس کا دل بہلانے کے لیے کہا، ''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم والوں کو قبرستان میں فون لگانے کی کیا ضرورت آن پڑی؟''

پونم نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اپنی آواز ذرا اونچی کی، ''لوکو'' میرے سوال کا جواب نہیں دینا ہو تو تم بھی نا کہہ سکتے ہو۔''

''میں نے سوچا میرے چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر آپ نے میرا جواب بھانپ لیا ہوگا۔''

''میں صاف الفاظ میں سننا چاہتی ہوں۔''

لوک ناتھ نے بتایا، ''آپ کو وہ ضرور قبول کرے گا۔''

''تمھیں یقین ہے؟''

''مجھے بھگوان میں شردھا بھی ہے۔''

''تب اس نے فوراً جواب کیوں نہیں دیا؟''

''شاید اس لیے کہ وہ اپنے گھر والوں سے صلاح و مشورہ کرنا چاہتا ہو۔''

لوک ناتھ کچھ کہے اس سے پہلے راہل کی ٹیکسی رکی۔ بریف کے ساتھ وہ اس میں سے باہر نکلا۔ پونم چونک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جواب ہاں میں ہوگا یا نا۔ راہل کے چہرے سے یہ اندازہ لگانے میں وہ ناکام رہی تھی۔ لوک ناتھ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔

راہل دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر پونم کے قریب آیا، لیکن مخاطب ہوا لوک ناتھ سے، ''آج میں نے لنچ نہیں کیا ہے۔''

''مس بھی بھوکی بیٹھی ہیں۔'' وہ بولا۔

اب راہل نے پونم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''آج ہم تینوں کسی اچھے ریسترا ں میں ساتھ لنچ لیں تو کیسا رہے گا؟''

''ونڈرفل!'' راہل کا اشارہ پونم کے لیے کافی تھا۔ خوشی سے وہ جھوم اٹھی، ''لوکو'' آج تم نا نہیں کہہ سکتے۔''

''لیکن...... لیکن آپ دونوں کے بیچ میرا کیا کام؟''

''تمھارا تو آج خاص کام ہے۔'' جواب راہل نے دیا، ''لنچ کا بل تم چکاؤ گے۔'' پھر مسکراتے ہوئے اس نے دوپہر کے اخبار کا ایک تازہ شمارہ بریف کیس سے نکالا اور پونم کے سامنے بڑھا دیا، ''یہ دیکھو!''

حیرانی اور خوشی سے پونم اچھل پڑی، ''لوکو! اس میں تو پہلے صفحہ پر تمھاری تصویر چھپی ہے — ایک نابینا نے بینک لٹیروں کے گروہ کو گرفتار کروایا......'' سرخی کے ساتھ وہ پوری خبر تیزی سے پڑھ گئی۔ ''بولو، اب بھی کچھ کہنا ہے۔''

''صرف اتنا'' بوتھ بند کرتے ہوئے اس نے فقرہ کسا، ''اب یہ مت کہنا کہ ٹیکسی کا میٹر بھی مجھے بھگتنا ہوگا۔''

راہل نے ہنس کر اس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پونم نے اس کا بایاں ہاتھ اور تینوں دوست ٹیکسی کی جانب بڑھ گئے۔

□□□

(ترجمہ: خورشید عالم)

پتہ:
F-58, Sector-40,
NOIDA-201301 (U.P.)

تنویر سلطانہ

آثار فیض آباد

اودھ کا مشہور تاریخی شہر فیض آباد اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ سے 78 میل دور مشرق میں دریائے گھاگھرا کے مشرقی کنارے (اونچا پار) پر آباد ہے۔ فیض آباد کی تاریخی شہرت اس بنا پر ہے کہ یہ 1765 سے 1774 آخر تک صوبۂ اودھ کی پہلی راجدھانی تھا۔ اجودھیا ایک قدیم تیرتھ استھان ہے جو دریائے گھاگھرا یا سرجو کے کنارے صدیوں سے آباد ہے۔ اجودھیا عوامی بولی میں بدل کر اودھ ہوگیا۔ مغلوں سے پہلے یہ علاقہ دہلی سلطنت کے ماتحت تھا۔ سولھویں صدی کے اواخر میں شہنشاہ اکبر نے اسے اپنی سلطنت کا علیحدہ صوبہ بنایا اور اس کا نام اودھ رکھا۔ اس کا حاکم صوبیدار کہلایا۔ اس دور میں اجودھیا کے گردونواح کا علاقہ غیر آباد تھا اور جہاں آج فیض آباد ہے وہاں کیوڑوں کا جنگل تھا۔ نوابی فیض آباد کی بنیاد اس وقت پڑی جب مغل بادشاہ محمد شاہ نے 1722 میں اپنے ایک وزیر برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری کو اودھ کا نواب یعنی صوبیدار نامزد کیا۔ برہان الملک نے لکھنؤ پہنچ کر پہلے وہاں کے سرکش شیخ زادگان کو سرنگوں کیا پھر مناسب جائے سکونت کی تلاش میں مشرق کی سمت روانہ ہوئے اور حویلی اودھ سے چار میل دور مغرب میں گھاگھرا کے مشرقی کنارے پر واقع ایک ٹیلے پر پڑاؤ ڈالا۔ پھر انھوں نے ٹیلے سے نیچے اپنے اہل وعیال کے لیے کچی مٹی کے بنگلے تعمیر کرائے۔ رفتہ رفتہ گھاگھرا کے کنارے ایک فصیل بند قلعہ اور چھاؤنی تعمیر کرائی۔ 1739 میں برہان الملک کی وفات کے بعد ان کے داماد صفدر جنگ نواب بنائے گئے جنھوں نے اس آبادی کو فیض آباد کا نام دیا۔ لیکن وہ بذات خود زیادہ تر لکھنؤ میں قیام کرتے تھے جو مغل فوجی سرداروں کا کیمپ تھا۔ ان کے دور میں مغل سرداروں نے وقت گزارنے کے لیے فیض آباد میں پختہ مکانات بنائے اور باغات لگوائے۔ 1754 میں صفدر جنگ کی وفات کے بعد فیض آباد کی ترقی رک گئی کیوں کہ ان کے بیٹے اور جانشیں نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا۔ وہ سال میں دو تین دن ہی اپنے آبائی شہر میں گزارتے تھے۔ یہ صورت 1764 میں بکسر کی جنگ تک جاری رہی۔ اس جنگ میں شکست کے بعد شجاع الدولہ فرار ہوکر فیض آباد آئے، یہاں سے لکھنؤ اور وہاں سے بریلی پہنچ کر نو ماہ تک انگریزوں کی انتقامی کارروائی کے ڈر سے روپوش رہے۔ پھر انگریزوں کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے جس کی رو سے شجاع الدولہ نے کمپنی کی ماتحتی قبول کی، اپنا کچھ علاقہ کمپنی کے حوالے کیا اور بطور تاوان چالیس لاکھ طلائی روپے ادا کیے۔ اس تصفیے کے بعد انھوں نے 1765 میں دفاعی مصلحت سے فیض آباد کو اپنی مستقل راجدھانی بنایا۔ برہان الملک کے پرانے قلعے اور فصیل کو توڑ کر ایک نیا قلعہ اور نئی فصیل تعمیر کرائی جو اتنی چوڑی تھی کہ اس پر گھوڑے بآسانی دوڑ سکتے تھے۔ فصیل کے نیچے دریا کی سمت گہری کھائیاں کھدوائیں۔ نئی سپاہ بھرتی کی، توپ خانہ قائم کیا اور انگلش بندوقیں خریدیں۔ انھوں نے نہ صرف قلعے کو فصیل بند کیا بلکہ شہر کے چاروں طرف بھی فصیل تعمیر کرائی۔ شہر میں چوک اور ترپولیہ کی تعمیر کرائی۔ اس زمانے کے 49 محلوں میں سے اکثر اب بھی باقی ہیں مثلاً سعادت گنج، رکاب گنج، فتح گنج، وزیر گنج، بیگم گنج، امانی گنج، قندھاری بازار، مغلپورہ، دہلی دروازہ، صدر بازار، نخاس اور خواص پورہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ شہر میں تین وسیع وعریض باغات لگوائے جن کے نام انگوری باغ، موتی باغ اور لال باغ تھے۔ ان میں انواع و اقسام کے پھول پودے اور درخت لگوائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ لکھنؤ کی سمت آصف باغ، بلند باغ اور اجودھیا میں دو باغات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ سب معدوم ہوگئے لیکن ان ناموں کے محلے باقی ہیں۔ قلعے کے اندر موتی محل شجاع الدولہ کی قیام گاہ تھا جو کھنڈر ہو کر مٹ گیا۔ ان کے علاوہ محلہ حسو کٹرہ کی مسجد، گرجی بیگ سے گپتار گھاٹ تک اور موضع جنورا سے موضع گوشائیں گنج تک دو شکار گاہیں بنوائیں، ان کے گرد کچی مٹی کی دیواریں کھڑی کرائیں اور ان میں کالے ہرن، چیتل اور بارہ سنگھے چھڑوائے۔

شجاع الدولہ کے حسن تدبیر سے نو سال کے قلیل عرصے میں فیض آباد میں وہ ترقی اور خوش حالی آئی کہ وہ دور دور تک مشہور ہوگیا۔ علما وفضلا، ہنرمند اور دست کار آ کر بسنے لگے اور دولت کی وہ فراوانی تھی کہ ہندوستان اور ولایت کے تجار اپنا مال یہاں لانے لگے۔ منشی فیض بخش نے اپنی کتاب "تاریخ فرح بخش" میں لکھا ہے کہ اگر نواب وزیر دس بارہ سال اور زندہ رہے ہوتے تو فیض آباد دوسرا شاہجہاں آباد بن جاتا۔ لیکن 1774 میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے جانشیں ان کی ایک بیوہ جناب عالیہ متعالیہ بہو بیگم صاحبہ کے اکلوتے بیٹے آصف الدولہ ہوئے جن کی عمر اس وقت محض 26 سال کی تھی۔ درباریوں کے بہکاوے میں آکر وہ اپنی ماں سے بدظن ہوگئے اور 1775 میں فیض آباد کو چھوڑ لکھنؤ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ راجدھانی کی منتقلی سے شہر کی زیادہ آبادی لکھنؤ منتقل ہوگئی اور انھی ناموں کے محلے وہاں آباد ہوگئے۔ لکھنؤ کی آبادانی فیض آباد کی ویرانی کا سبب بنی۔ بہو بیگم نے جو خود ایک بڑی جاگیر کی مالک تھیں فیض آباد میں رہنا پسند کیا۔ جب تک وہ زندہ رہیں شہر میں کچھ رونق باقی رہی۔ 1816 میں ان کی وفات کے بعد وہ بھی جاتی رہی۔ 1856 میں کمپنی سے اودھ کے الحاق کے بعد نوابی سلسلہ ختم ہوگیا۔ انگریزوں نے فیض آباد میں نوابی دور کی چھاؤنی کی جگہ ایک ماڈرن کنٹونمنٹ تعمیر کی جو اب ڈوگرہ رجمنٹ کا مرکز

ہے۔ فیض آباد شہر کو ضلع کا صدر مقام بنایا گیا اور اسے کمشنری کا درجہ دیا گیا۔

فیض آباد کی تاریخی عمارتوں میں سے چار جواب بھی صحیح وسالم ہیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی چوک ہے جس کے مغرب میں اس زمانے کا ایک درہ، شمال میں یک درہ اور جنوب میں ترپولیہ ہے جس سے سیدھی سڑک الہٰ آباد کو جاتی ہے۔ مشرق میں موتی باغ تھا جواب ایک گھنا محلہ ہے۔ چوک کے وسط میں ایک گھنٹہ گھر ہے۔ اس کی مغربی سمت شجاع الدولہ کے ایک افسر حسن رضا خاں کی بنائی ہوئی نہایت عمدہ مسجد ہے جس میں اہل تشیع نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک چوک میں لان، حوض اور فوارے موجود تھے۔ اب نئی عمارتوں نے اس کا دائرہ تنگ کر دیا ہے۔

دوسری عمارت چوک کے مشرق میں واقع نواب شجاع الدولہ کا مقبرہ ہے جو عوام میں انگریزوں کے زمانے سے گلاب باڑی کے نام سے معروف ہے کیونکہ یہاں ریاستی محکمۂ باغبانی کی ایک نرسری ہے اور اس کے لان پر انواع اقسام کے گلابوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اس مقبرے کو نواب وزیر نے خود اپنی زندگی میں اپنی نگرانی میں اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ ان کے اسلاف نواب وزیر برہان الملک اور نواب وزیر صفدر جنگ مغل روایت کے مطابق دہلی میں مدفون ہوئے۔ لیکن شجاع الدولہ نے فیض آباد کی سرزمین میں مدفون ہونا پسند کیا۔

یہ عمارت ایک وسیع وعریض پارک جیسی ہے۔ اس کے قلب میں گنبد والے چوکور مقبرے میں نواب وزیر مدفون ہیں۔ عمارت میں داخلہ ایک بلند وبالا دروازے سے ہے۔ اس دروازے سے ملحق بائیں جانب دہلی کی جامع مسجد جیسی اونچی مسجد ہے۔ دائیں جانب چند حجرے اور دالان ہیں۔ باقی اطراف میں تقریباً 27 فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی چہار دیواری ہے جو مقبرے کی یہ اراضی کو دخل بے جا اور خورد برد سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ داخلے کے دروازے سے مقبرے کے چلو تک ایک چالیس فٹ چوڑی سڑک ہے جس کے وسط میں 1950 میں اشوک کی لاٹ نصب کی گئی۔ اس لاٹ کے کتبے پر درج ہے کہ یہ لاٹ اودھ میں زمین داری کے دوسو سالہ نظام کے خاتمے کی یادگار کے طور پر لگائی گئی ہے۔ گلاب باڑی میں روزانہ صبح وشام عام شہری چہل قدمی اور ہواخوری کے لیے آتے ہیں اور بزرگ حضرات مقبرے کے سامنے پڑی بنچوں پر بیٹھ کر محو گفتگو ہوتے ہیں۔ افسوس کہ اتنی عظیم الشان عمارت کو یونیسکو نے ہریٹیج کا درجہ نہیں دیا۔

تیسری عمارت دلکشا یعنی بہو بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی ہے۔ دریا کے قریب ایک وسیع وعریض رقبے پر واقع ایرانی طرز کی یہ عمارت اپنی بلند وبالا چہار دیواری کے ساتھ اب بھی صحیح وسالم ہے۔ داخلہ جنوب کے دروازے سے ہے۔ اندر مغرب کی سمت دہلی کی جامع مسجد کے طرز کی ایک بلند وبالا مسجد ہے۔

اس مسجد کے صحن کے بائیں ہاتھ نیچے بہو بیگم کا حمام ہے جس میں ایک قنات کے ذریعے گھاگھرا سے پانی آتا تھا اور ایک جھرنے کی شکل میں حمام کے حوض میں گرتا تھا۔ جنوبی حصے میں بہو بیگم کی قیام گاہ اور دیوان خاص ہے۔ یہ ایرانی معماری کا ایک نفیس نمونہ ہے۔ بہو بیگم نے اپنی زندگی میں کمپنی بہادر کو خطیر رقمیں دے کر اپنے لواحقین اور ملازمین کے لیے وثیقوں (Annuities) کا بندوبست کر دیا تھا۔ 1900 میں جب ان کی ڈیوڑھی کے دربان لاولد فوت ہوئے تو شہر کے عمائد نے کمشنر بہادر فیض آباد سے درخواست کی کہ ان کے وثیقوں کی رقم سے اس عمارت میں غریب بچوں کے لیے ایک اسکول چلانے کا حکم جاری کیا جائے۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور تب سے اس ڈیوڑھی میں وثیقہ پرائمری اسکول، وثیقہ عربک کالج اور ایک بورڈنگ ہاؤس قائم ہیں۔ ڈیوڑھی کی سڑک کے مقابل محلے میں بہو بیگم صاحبہ کے ایک ملازم جواہر علی خاں کی تعمیر کردہ ایک امام بارگاہ ہے اور اس سے ملحق مکانات میں نوابی دور کے باشندوں کے اخلاف رہتے ہیں۔

چوتھی عمارت شہر کے ناکہ مظفرہ محلہ میں واقع بہو بیگم صاحبہ کا مقبرہ ہے۔ یہ بھی ایک عالیشان عمارت ہے لیکن بے اعتنائی کی وجہ سے خستگی اور شکستگی سے دوچار ہے۔ گلاب باڑی کے برعکس یہاں کوئی شہری ہواخوری کو نہیں آتا کیوں کہ یہاں ہر طرف اجاڑ میدان ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ مقبرہ ایک وسیع وعریض باغ کے وسط میں بنایا گیا جس کا نام باغ جواہر علی خاں تھا۔ اب اس باغ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نہ مقبرے کے گرد کوئی چہار دیواری ہے جو اسے دخل بے جا سے محفوظ رکھ سکے۔

بہو بیگم صاحبہ نے اپنی زندگی میں اپنے ذاتی اثاثے سے تین لاکھ چاندی کے روپیوں کی رقم اپنے معتمد ملازم داراب علی خاں کی نگرانی میں اپنے مقبرے کی تعمیر کے لیے اور اپنی جاگیر کے لگان سے دس ہزار چاندی کے روپیوں کی سالانہ رقم اس کی دیکھ بھال کے لیے وقف کیا تھا۔ بہو بیگم کا انتقال 1816 میں ہوا۔ لیکن دیواروں کی تعمیر تک تین لاکھ صرف ہو چکے تھے۔ چنانچہ 1857 تک اس کی تعمیر نامکمل رہی۔ انگریزوں کی عملداری بحال ہونے پر پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ نے اسے مکمل کرایا۔ نوابی لکھنؤ کی عمارتوں کی طرح یہ چاروں عمارتیں پختہ اینٹوں، چونے، سرخی اور گچ کے مسالے سے تعمیر کی گئی ہیں۔ چونکہ اودھ کے علاقے میں پتھر دستیاب نہیں تھا لہٰذا پتھر کا استعمال کم ہے۔ یہ فنِ معماری کا کمال ہے کہ دوسو سال سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود یہ عمارتیں صحیح وسالم ہیں لیکن مرمت اور نگہداشت کے فقدان میں وہ دن دور نہیں جب یہ بھی کھنڈر ہو جائیں گی۔

□□□

پتہ:
Amu City Girls High School
Qazi para, Aligarh (U.P.) - 202001

فروغ صبا جامی

مزدور بچے

ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی آباد ہے جو غربت و افلاس کی آخری سیڑھی پر اپنی تمام تر مصیبتوں اور پریشانیوں کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ ہمدردی کے مستحق یہ بدنصیب خاندان وہ ہیں جن کے کفیل یا تو ہلاک اور بیماری کی نذر ہوگئے یا پھر مفلسی کی تاریک راہوں پر چلتے چلتے تھک چکے ہیں۔ ایسے گھروں میں اپنے ساتھ لاتعداد مسائل لے کر پیدا ہونے والے بچے جوانی کی منزل سے گزرے بغیر ہی بڑھاپے میں داخل ہوجاتے ہیں۔ پیدائشی حقوق سے محروم یہ بچے اپنے گھر کی تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے محنت مزدوری کرتے ہیں۔ اپنی ننھی ننھی خواہشوں کا گلا دبا کر اپنے گھر والوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ تعلیم سے ناآشنا زندگی کی ہر آسائش سے دور یہ بچے اپنا بچپن سخت ترین مشقت اور ذلت میں گزارتے ہیں۔

حصول معاش کے سلسلے میں یہ بچے کہاں کہاں نظر نہیں آتے کیا کچھ نہیں کرتے۔ مئی جون کی چلچلاتی دھوپ ہو یا دسمبر جنوری کی کڑکڑاتی ہوئی سردی، بارشوں کا شور ہو یا طوفانی ہواؤں کے جھکڑ ان ننھے مزدوروں کی ضرورت موسموں کے بدلتے ہوئے تیوروں کا سامنا کرتی ہے۔ آٹھ گھنٹے سے لے کر بارہ چودہ گھنٹے مشقت کرنے والے یہ محنتی بچے ہر جگہ نظر آئیں گے۔ آگ کے بھٹوں پر اینٹوں کی پکائی ہو یا شیشے اور دھاتوں کے ظروف بنانے کے کارخانے، کپاس بیلنے کا خطرناک کام ہو یا بیلے ہوئے گنے کے رس سے کڑھاؤ میں گڑ بنانے کا عمل، فصلوں کی کٹائی کے کام سے لے کر آٹا، مرچ کی پسائی، بھرائی کا کام، منڈیوں اور بازاروں میں بار برداری کا کام، یا سیمنٹ گارے کی ڈھلائی، آگ جیسے کول تار سے سڑکیں بنانے کا کام، سڑکوں پر اخبار کا دھندا، سگنلز پر رکتی ہوئی گاڑیوں کی صفائی، یا ٹیکسی اسٹینڈوں پر چھوٹی بڑی گاڑیوں کی دھلائی، پٹرول پمپوں پر گاڑیوں میں پٹرول ڈالنے کا کام، یا موٹر گیراجوں میں مرمت کا کام، بس اسٹاپ پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ یہ باہمت بچے ایسے بے شمار کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود معاشرے کی ناانصافیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

ایک سروے کے مطابق مہینے میں 200 سے 300 گھنٹے تک دکانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے اکثر بچے دس روپے سے لے کر 40 روپے روز پر کام کرتے ہیں۔ اپنی محنت کا ناکافی معاوضہ وصول کرنے والے یہ بچے کارخانوں اور دکانوں کے کام کے ساتھ ساتھ اپنے آجر کے گھر یا ہر کے وہ تمام کام بھی انجام دیتے ہیں جو کوئی غلام ہی کرسکتا ہے اور ان کاموں کا ان کو کوئی اضافی معاوضہ بھی ادا نہیں کیا جاتا۔

ہمارے ملک کے اکثر شہروں کی منڈیوں میں بار برداری کا کام بھی یہ بچے انجام دیتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ملک میں کیا کوئی ایسا قانون موجود ہے جو ان بچوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دے۔ ہم نے ''لیبر قوانین'' کی عدالت کے سول جج اور وکیل سے چند سوالات کیے جو اس طرح ہیں:

1. کیا مروجہ لیبر قوانین میں کم عمر بچوں کے حقوق کا احاطہ کیا گیا ہے؟
2. کیا قوانین کے ذریعے کوئی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے؟
3. کیا سرکاری سطح یا نجی سطح پر کوئی قانون موجود ہے؟
4. کیا بچوں کے حقوق کی خلاف ورزی کے سلسلے میں قانون موجود ہے؟ اور اس پر عمل درآمد ہوتا ہے یا نہیں؟

ان سوالات کے ملنے والے جوابات سے یہ بات واضح ہوئی کہ لیبر قوانین بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ناکافی ہیں اور قطعی طور پر بے نتیجہ ثابت ہوئے ہیں۔ آجر نہ تو قانون پر عمل کرتا ہے اور نہ قانون بچوں کا کوئی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ بچوں کے کام کرنے کے اوقات پر پابندی، بچوں کے کام کی مدت کا نوٹس، کارکن بچوں کا رجسٹریشن، طبی معائنے کا اختیار، تعزیر اور ضابطہ کار، ان میں سے کسی پر عمل نہیں ہوتا۔ اکثر آجر اپنے بنائے ہوئے قوانین پر عامل ہیں جو سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔ وہ کیوں فکر مند ہوں، آخر کون سے قانونی ہرکارے ان ننھے کارکنوں کی طرف سے متفکر ہیں یا ان جابر آجروں کی گوشمالی کے لیے بے قرار ہیں۔ موجودہ قوانین تو صرف کارخانوں یا فیکٹریوں تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ ادھر ادھر یہاں وہاں جو بچے کام کرتے پھرتے ہیں وہاں کوئی قانون ہی نہیں، لگتا ہے یہ جگہیں متذکرہ اور جملہ قوانین سے بالاتر ہیں۔

ہمارے ملک میں کیا کوئی ایسا نہیں جو ان جگہوں کی نشان دہی کرے؟ ان بچوں کے لیے میدان عمل میں آکر ان کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے؟ معاشرے سے برائیوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکے۔ جو دعویدار طرح طرح کے سیمینار منعقد کرتے ہیں کیا ان میں کوئی ایسا نہیں جو بچوں کے لیے آگے آئے اور ان کے مسائل اور احساسات کو سمجھنے اور جاننے کے ساتھ ساتھ ان مسائل کے حل کی کوششیں کرے۔ بھارت میں بسنے والے یہ بچے کیا بھارتی قوم کے فرزند نہیں۔ کیا ان کی قومیت مشکوک ہے؟ ان کے لیے کون انصاف فراہم کرے گا؟ اور کب کرے گا؟ یہ سوال ہماری، آپ کی، سب کی توجہ کا طالب ہے۔!!!

□□□

پتہ:
C/o Janta Medical Store,
Purani Karim Ganj Road No.-1,
Gaya-823001 (Bihar)

افتخار الزماں

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

ہمارے ملک کی تاریخ بے شمار قومی رہنماؤں کے کارناموں سے اٹی پڑی ہے۔ انھی میں ایک نمایاں نام جدید ہندوستان کے معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی قومی خدمات اور اعلیٰ صلاحیتوں کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں پس از مرگ ملک کے عظیم ترین اعزاز ''بھارت رتن'' سے نوازا۔ ان کی پیدائش 14 اپریل 1891 میں مدھیہ پردیش کے ایک اچھوت مہار خاندان میں ہوئی تھی۔ بھیم راؤ امبیڈکر صوبیدار رام جی کی 14 ویں اولاد تھیں۔ لیکن ان میں سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہی زندہ رہیں۔ بھیم راؤ امبیڈکر ابھی محض دو ہی سال کے تھے کہ ان کے والد فوجی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور جب وہ 6 سال کے ہوئے تو والدہ بھی اس دارفانی سے کوچ کر گئیں۔ بھیم راؤ کے والد انھیں اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے، تاکہ وہ اس وقت معاشرے میں پھیلی ہوئی نابرابری کا مقابلہ کرسکیں۔ انھیں طالب علمی کے زمانے سے ہی چھوا چھوت کے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔ اسکول میں انھیں جہاں اعلیٰ ذات کے بچوں سے دور رکھا جاتا، وہیں اساتذہ بھی ان کی کاپیوں کو ہاتھ میں لینے سے گریز کرتے۔ اگر اسکول میں پانی پینا ہوتا تو کوئی لڑکا اوپر سے منہ میں پانی گرا دیتا تھا۔ اسی طرح سماجی ناانصافی کا سامنا انھیں کئی مرتبہ کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے والد سے ملنے جارہے تھے دونوں بھائی اسٹیشن پر اترے۔ کسی وجہ سے ان کے والد ان کو لینے نہ پہنچ سکے تھے۔ گاؤں دور تھا اور راستہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے دونوں کو ایک بیل گاڑی مہیا کرادی۔ دونوں بھائی اس گاڑی میں بیٹھ کر کچھ ہی دور گئے تھے کہ باتوں باتوں میں کوچوان نے ان کے بارے میں معلوم کیا کہ وہ کون ہیں؟ جیسے ہی اسے ان کی ذات کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس نے ان دونوں کو گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ دونوں بھائی روتے بلکتے پیدل ہی گھر پہنچے۔ راستے میں کسی نے ان کو پینے کے لیے پانی تک نہیں دیا۔ بھیم راؤ کو اس طرح کی بے شمار اذیتیں سہنی پڑیں۔ اس زمانے میں تعلیم کی کمی کے باعث ذات اور برادری کی نابرابری اور بھید بھاؤ بہت زیادہ تھا۔ نائی ان کے بال تک نہیں کاٹتا تھا اور اساتذہ انھیں سنسکرت نہیں پڑھاتے تھے۔

پورا خاندان ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہتا تھا۔ ان کے پڑھنے کے لیے جگہ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ اس طرح ان کے والد نے بچے کی تعلیم کے لیے گھر پر پڑھائی کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ بھیم راؤ کو جلدی سلا دیا جاتا اور رات دو بجے انھیں پڑھنے کے لیے جگا دیا جاتا۔ اس طرح بھیم راؤ ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا مطالعہ جاری رکھ پاتے تھے۔ بھیم راؤ امبیڈکر نے مراٹھا اسکول سے 1907 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ چند ماہ بعد ہی ان کی شادی رمابائی سے کر دی گئی۔ انھوں نے انٹر کی تعلیم الفنسٹن کالج سے مکمل کی اور پھر یہیں سے بی۔ اے۔ کیا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ بھیم راؤ اپنی تعلیم جاری رکھے لیکن گھر کی مالی حالت کے پیش نظر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اتفاق سے انھی دنوں بڑودہ ریاست کی جانب سے کچھ قابل طالب علموں کے لیے ولایت جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظائف کا اعلان کیا گیا اور بھیم راؤ امبیڈکر کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ امبیڈکر 1913 سے 1917 تک امریکہ اور انگلینڈ میں رہے۔ جہاں انھوں نے معاشیات، سیاسیات اور قانون کا گہرا مطالعہ کیا اور قانون میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں انھوں نے امریکی حالات کو قریب سے دیکھا اور بہتر تعلیم کے ساتھ ساتھ تبادلۂ خیالات کی آزادی، قومی مساوات اور ہم آہنگی کے جذبے سے بطور خاص متاثر ہوئے۔

مہاراجہ بڑودہ کی جانب سے وظیفہ دیتے وقت یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 10 سال تک ریاست کے لیے اپنی خدمات انجام دیں گے۔ تعلیمی سفر کے دوران ہی بھیم راؤ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ہندوستان میں کروڑوں دلتوں کی زندگی بہتر بنائے بغیر اس ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ اس لیے جہاں اچھوتوں کی سماجی اصلاح ضروری ہے وہیں حکومت پر بھی یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان کے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق کو بحال کرے۔ ان کا تحفظ کرے۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے ایک مراٹھی اخبار بھی نکالا۔ ان کے مطابق پسماندہ طبقات کو کسی کی ہمدردی یا رحم کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انھیں ان کا حق دیا جانا چاہیے۔ بھیم راؤ امبیڈکر نے سماج کے پسماندہ طبقات کے اندر عزت نفس کو ابھارا اور احساس کمتری سے نجات دلانے کے لیے عملی طور پر کوششیں کیں۔ پسماندہ طبقات کے اندر تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کے مطابق تعلیم ہی ایک ایسی نعمت ہے جو انسان کو اعلیٰ اور برتر بناتی ہے۔ تعلیم

حاصل کر کے ہی آدمی انسان بنتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر انھوں نے پسماندہ طبقات کے لیے کئی اسکول کھولے۔ طلبہ کو مفت کتابیں مہیا کرائیں۔ ممبئی میں انھوں نے سدھارتھ کالج آف آرٹس اینڈ سائنسز کھولا۔ محض 28 سال کی عمر میں دلتوں کے لیے خصوصی اختیارات کی مانگ کی اور یہ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ 1919 میں آئین میں دلتوں کی ایک علاحدہ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ بھیم راؤ امبیڈکر نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ نچی ذات کے دلتوں کے ساتھ برابری کا سلوک کریں اور ان کے حقوق کو پامال نہ کریں۔ عام لوگوں تک اپنی بات کو پہنچانے کے لیے امبیڈکر نے کولھاپور کے مہاراجہ کی مالی مدد سے 31 جنوری 1920 کو ایک مراٹھی رسالہ ''لوک نائک'' جاری کیا۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ دلتوں کی بھلائی صرف اسی میں مضمر نہیں ہے کہ وہ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں بلکہ معاشرے میں چھوا چھوت اور ذات پات کے ناسور کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ کسی بھی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے تعلیم کا حصول لازمی ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔ بہ الفاظ دیگر عورتوں کی ترقی پر ہی اچھوت سماج کی ترقی منحصر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لڑکیوں کی شادی جلدی نہ کریں۔ امبیڈکر سماجی رشتوں میں معمولی رد و بدل لانے کے بجائے ذات پات کے نظام کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ ہندوستان کے تمام شہری یکساں اختیارات اور حقوق کے مالک ہوں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا غلام نہ بنائے اور اس کو حقارت کی نگاہوں سے نہ دیکھے جو اس وقت ایک عام بات تھی۔ انھوں نے ایک نیک دل انسان کی طرح دلتوں کے مسائل کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان کے درد و کرب کو بھی محسوس کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ دلتوں کی بہتری کی بات کوئی بھی شخص کر سکتا ہے لیکن ان کے درد و کرب کو ایک دلت ہی محسوس کر سکتا ہے۔ انھوں نے دلتوں کے مسائل کا جتنا قریب سے مشاہدہ کیا اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔

ملک میں جب آئین سازی کا کام شروع ہوا تو انھوں نے اچھوتوں کے مسائل کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اٹھایا اور آئین میں تمام شہریوں کے لیے اقتصادی، سماجی، سیاسی آزادی اور مساوات کے حقوق کو یقینی بنانے پر زور دیا۔ مذاکرہ کے حقوق سے متعلق ان کے یہ مطالبات آئین ہند میں بطور قانون تسلیم کر لیے گئے اور یہ سب کچھ امبیڈکر کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ آزادی کے بعد جمہوری نظام کو اپنایا گیا۔ ابراہیم لنکن کی جمہوریت کی تعریف سے اتفاق کرتے ہوئے انھوں نے ایک بات کا اضافہ یہ کیا کہ اس طرز حکومت میں تمام شہریوں کو بغیر کسی تفریق کے یکساں اقتصادی، سماجی اور سیاسی اختیارات حاصل ہوں۔

آزادی کے بعد جب سیاست داں اپنا سارا وقت سیاسی مفادوں میں لگانے لگے تو انھوں نے سماجی کاموں کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ سماجی اصلاح کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔ انھوں نے دلتوں کو جو مقام عطا کرایا وہ کوئی اور نہیں کرا پاتا۔ انھوں نے پسماندہ طبقات کی بھلائی کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ موقع اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران انھوں نے پسماندہ طبقات کی وکالت کی اور ان کے لیے ایک علاحدہ Electro Act کے قیام پر زور دیا۔ Legislative Council کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود کے لیے کئی بل پیش کیے۔ پہلے بنگال پھر ممبئی سے انھیں ہندوستان کی آئین ساز کونسل کا ممبر منتخب کیا گیا۔ 1947 تک انھوں نے ایک قومی رہنما اور ماہر قانون کے طور پر اپنی نمایاں پہچان بنالی تھی۔ لہٰذا اگست 1947 میں انھیں آئین ہند کا مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا اور بعد میں ان کی ماہرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے آئین ساز کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستانی آئین کا ایک جامع مسودہ تیار کیا جس میں بنیادی حقوق پر خصوصی توجہ دی گئی تھی اور پسماندہ طبقات کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا۔ ذات پات کی بنیاد پر ہر طرح کے بھید بھاؤ اور تفرقے کو قانونی طور پر ختم کر دیا گیا۔ ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں اپنی کابینہ میں شامل کیا اور انھیں آزاد ہندوستان کا پہلا وزیر قانون بنایا گیا اور وہ اکتوبر 1951 تک اس منصب پر فائز رہے۔ وزارت سے الگ ہو کر بھی وہ آخر وقت تک پسماندہ طبقات کی بھلائی کے لیے کوشاں رہے۔ اسی باعث انھیں پسماندہ طبقات کا مسیحا کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ کی زندگی کا یہ سفر 6 دسمبر 1956 کو ان کی موت پر ختم ہوا۔ بھیم راؤ امبیڈکر کی کوششوں سے دلت سماج کے اندر زندگی جینے کا شعور پیدا ہوا، زندگی کے تئیں مثبت سوچ پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر امبیڈکر کو اپنی کامیابی پر رشک تھا—

''آج یہ کارواں جہاں دکھائی دے رہا ہے اس کو میں بڑی مشکل سے آگے لایا ہوں۔ راستے میں حائل دشواریوں کو پار کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔ اگر میرے لیفٹیننٹ اس کارواں کو آگے لے جانے کے لائق نہیں ہیں تو انھیں اسے یہیں چھوڑ دینا چاہیے لیکن کسی بھی حال میں انھیں کارواں کو پیچھے نہیں جانے دینا چاہیے۔''

ع چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ

□□□

پتہ:
K-78/A, Ist Floor,
Batla House, Okhla, New Delhi-110025

رضوان رضوی

ہم اور ہمارے بچے

بقول روسو انسان کمزور پیدا ہوتا ہے اسے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بے سروسامان ہوتا ہے، اسے مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ناسمجھ ہوتا ہے، اسے عقل آموزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو چیزیں اس کے پاس پیدائش کے وقت نہیں ہوتیں وہ اسے جسمانی اور ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ تعلیم سے ملتی ہیں اور تعلیم کے لیے بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی آغوش ہے۔ وہ زندگی کا پہلا سبق وہیں سیکھتا ہے۔ سائنس کی جدید تحقیقات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ بچے کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کا اصل مقام اسکول اور کالج نہیں بلکہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہے۔ چنانچہ گھر کے ماحول کا بچے کی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ بچہ بہت ساری باتیں اپنے والدین اور گھر کے دیگر افراد سے سیکھتا ہے، ان کے طور طریقوں کی نقل کی کوشش کرتا ہے جو بعد میں اس کی شخصیت کا جز بن جاتے ہیں۔ گھر کے افراد کے طرز عمل سے وہ محبت، ہمدردی کے جذبات یا پھر خودغرضی، بے ایمانی اور نفرت کے جذبات سے روشناس ہوتا ہے۔ اگر والدین اور گھر کے دیگر افراد مہذب، تعلیم یافتہ، نیک چلن اور خوش اخلاق ہوں تو کہا جاسکتا ہے کہ گھریلو حالات اچھے ہیں پھر بچے وہاں یقیناً اچھی باتیں سیکھیں گے اور اگر والدین مہذب، تعلیم یافتہ، نیک چلن اور خوش اخلاق نہ ہوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ گھریلو حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں بچے وہاں بری باتیں سیکھیں گے۔ اس طرح بچے کے کردار کی تشکیل کی بنیاد گھر پر ہی پڑ جاتی ہے اور سیرت کی تشکیل تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔

آج اکثر والدین کو یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے بچوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے بچے جھوٹ بولتے ہیں، کہنا نہیں مانتے، بڑوں کی عزّت نہیں کرتے، تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے، فحش اور غیر معیاری فلمیں دیکھتے ہیں اور بے ہودہ ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ گویا ان کی اولاد ان کے لیے عذابِ جان یا زحمت بنی ہوئی ہے۔ وہ اصلاح کا جو بھی طریقہ اختیار کرتے ہیں، اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلتا ہے۔ دوسری طرف اولاد کی شکایتیں بھی کم قابلِ توجہ نہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ والدین اور اولاد کی اس کشمکش پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ وہ بنیادی اصول کیا ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے ان مشکلات کو دور کیا جاسکتا ہے۔

ماہرین نفسیات نے اپنی طویل تحقیقات کے بعد یہ اصول بھی واضح کردیا ہے کہ ایک بچے کی اچھی بری قسمت پہلے چھ سال کی عمر میں طے ہوجاتی ہے۔ یہ قسمت آسمان کی کوئی غیبی طاقت نہیں بناتی بلکہ خود والدین اس کے معمار ہوتے ہیں۔

اولاد کا اچھا مستقبل سب کی آرزو ہے۔ کوئی بھی والدین ایسے نہیں ہوں گے جو اس الزام کو تسلیم کرلیں کہ وہ اپنے بچوں کے دشمن ہیں، بچوں کے ساتھ دشمنی کررہے ہیں۔ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ جب بھی ان کے بچے کے ساتھ کوئی چھوٹا یا بڑا ناانصافی کرتا ہے تو وہ اس وقت آمادۂ انتقام ہوجاتے ہیں لیکن وہ خود بڑی بڑی ناانصافیاں کرتے رہتے ہیں۔ یہ ناانصافیاں بچے کی شخصیت کا خون کرتی ہیں اور شخصیت کا خون درحقیقت زندگی کا خون کردینے سے بھی زیادہ خوف ناک جرم ہے۔

روسو کے مطابق ایک باپ جو اپنے بچوں کو صرف کھانا اور کپڑا مہیا کردیتا ہے، وہ اپنی ذمے داری کا ایک تہائی حصہ پورا کرتا ہے۔ سماج کا اس پر حق ہے کہ وہ ایسے خاندان پیدا کرے جو سماج کے لیے فائدہ مند ہوں اور ریاست کا اس پر حق ہے کہ وہ اچھے شہری پیدا کرے۔ ہر وہ شخص جس پر یہ تین حقوق ہیں اور جو ان کو ادا نہیں کرتا وہ ایک مجرم ہے۔ جو باپ اپنے فرائض ادا نہ کرے اسے باپ بننے کا کوئی حق نہیں۔

بچہ خواہ ایک ماہ کا ہی کیوں نہ ہو، اسے گوشت کا ایک بے شعور لوتھڑا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ذہن نشیں کرلینا چاہیے کہ وہ گھر کے ماحول کی ایک ایک حرکت اپنے دل و دماغ میں جذب کررہا ہے۔ اس لیے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ والدین بعض ناروا اعمال کو اپنے بچوں کے سامنے یہ سمجھ کر روا قرار دینے کی جھوٹی تسلی حاصل نہ کریں کہ بچوں میں سوجھ بوجھ نہیں۔ بے شک بچوں میں سوجھ بوجھ نہیں ہوتی لیکن ان کے تحت شعور میں ہماری ایک ایک حرکت قبول کرنے کا جذبہ برابر موجود ہوتا ہے۔ کوئی جھوٹ، کوئی ناراضگی، کوئی گھڑکی اور کوئی بُرا وتیرہ ایسا نہیں جو بچے کے ننھے سے دماغ میں اپنے امٹ نقوش نہ چھوڑ جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنی اولاد کے سامنے حتی الامکان اپنے اخلاق و عادات کا اچھے سے اچھا نمونہ پیش کریں۔

بچوں کی شخصیت کا احترام بھی ضروری ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اپنے بچوں کی شخصیت کا احترام کرتے ہیں۔ جاہل تو جاہل اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس وصف سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ تقریباً ہر روز بچوں کی ہتک کرتے ہیں، انھیں گالیاں دیتے ہیں، ڈانٹتے ڈپٹتے ہیں اور جھڑکتے رہتے ہیں، بات بات پر ٹوکتے رہتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات میں عیب نکالتے رہتے ہیں۔ انھیں نکما، نالائق، کام چور، بے وقوف اور گدھا کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ لعن طعن بچے کی شخصیت پر نہایت بری طرح اثرانداز ہوتی ہے۔ اس قسم کے وتیرے سے بعض اوقات بچے کے دل میں والدین کے خلاف ایسی گہری نفرت پیدا ہوجاتی ہے کہ آخر عمر تک دور نہیں ہوسکتی۔ گویا ہم اپنے بچوں کی توہین کرکے آئندہ عمر میں اپنی توہین کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔

کچھ والدین اپنے بچوں سے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں۔ اس کا

اثر بھی ان پر اچھا نہیں پڑتا اور کچھ والدین ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بچوں پر بہت زیادہ سختی کرتے ہیں۔ اس سے بھی انھیں نقصان پہنچتا ہے۔ ان کا آزادی سے کام کرنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ آزادی ہے اور جب آزادی سے کام کرنے کے مواقع نہیں ملتے تو حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور ان میں دیگر برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ والدین کے رویے میں اعتدال ضروری ہے۔

بچوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے عام طور پر دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں بچوں کو ڈر، خوف، دھمکی اور مار پیٹ کے ذریعے ناپسندیدہ کاموں سے روک کر جبراً اچھے کاموں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں سختی سے مطلق کام نہ لیا جائے۔ نہ ڈرایا جائے، نہ سزا دی جائے بلکہ محض اچھے اور پسندیدہ کاموں کی ترغیب دلائی جائے اور بچہ کوئی اچھا کام کرے تو تعریف کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ڈرانے اور دھمکانے کے مقابلے میں ترغیب و تعریف سے کام لینا چاہیے۔ یہ زیادہ مؤثر اور کامیاب طریقہ ہے اور اس سے بچوں کی شخصیت کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔

بچے کے عیب کبھی اس کے منہ پر بیان نہ کیجیے۔ اگر وہ کند ذہن ہے، سبق یاد نہیں کرتا ہے، وقت پر اسکول نہیں پہنچتا ہے، جھوٹ بولتا ہے یا گھر سے پیسے چرا کر لے جاتا ہے تو اسے اس کی یہ خامیاں اور کمزوریاں یاد دلا دلا کر اسے شرمندہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ طریقِ عمل کبھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتا۔ مار پیٹ کرنے یا شرمندگی دلانے سے بچے کے دل میں اصلاح کا خیال تو درکنار الٹی بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ جس بچے میں کسی طرح کی خامی پائی جاتی ہو اسے دوسرے بچوں کی بہ نسبت زیادہ ہمدردی اور شفقت کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو ایک سازگار ماحول میں محسوس کرے۔ ہمدردی اور حوصلہ افزائی نکمے سے نکمے بچے میں بھی نہایت عمدہ تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ بچے کو شاباشی دیجیے اور اس کی تعریف کیجیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ذرا سی تعریف اور توجہ سے بچے کی زندگی کا رخ بدل جائے گا۔

بچے کی عادات اور خیالات کی تعمیر یا اس کی اخلاقی اصلاح و تہذیب ایک نہایت ہی کٹھن مسئلہ ہے۔ کچھ والدین اپنے بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسکول کی تعلیم اور ماحول سے وہ خود بخود سدھر جائیں گے۔ مگر یہ ایک وہم باطل ہے۔ دراصل بچوں کی اخلاقی تربیت ایک مشکل فن ہے۔ جب تک بچے کی ذہنی سطح اور اس کے فطری رجحان کو اس کے ماحول کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی اس وقت تک ہم اس کے مستقبل کی تعمیر میں کوئی تعاون نہیں کر سکتے۔ جب بھی بچے سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو مثلاً چوری، جھوٹ، فریب وغیرہ تو اس صورت میں ہمارا فرض ہے کہ مرض کے علاج سے پہلے مرض کی تشخیص کر لیں اس دنیا میں کوئی برائی ایسی نہیں جس کی پشت پر کوئی حقیقی مجبوری نہ ہو۔ اس مجبوری کو سمجھنا اور اسے دور کرنا ہی کسی برائی یا بداخلاقی کا اصل علاج ہے۔

اکثر اوقات بچے سے غلطی سرزد ہوتی ہے لیکن اس کا سبب اس بچے کے پاس نہیں ہوتا، ہمارے پاس ہوتا ہے۔ جب ہم اپنی روزانہ زندگی کا جائزہ لیں گے تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم ارادی یا غیر ارادی طور پر خود اپنے بچوں کو جھوٹ بولنے کی تربیت دیتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص جس سے ہم ملنا نہیں چاہتے ہمارے دروازے پر آئے تو ہم اپنے کسی بچے سے کہلوا دیتے ہیں کہ "ابا جان گھر پر نہیں ہیں۔" یا اگر کوئی شخص عاریتاً کوئی چیز مانگنے کے لیے آئے تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ "وہ تو کوئی اور شخص مانگ کر لے گیا ہے۔" ہمارے ایک دوست نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ وہ کیبرے شو دیکھنے کے لیے کبھی نہ جائے کیونکہ وہاں اسے وہ دیکھنے کو ملے گا جو اسے ہرگز نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس نصیحت کے باوجود ایک رات بیٹا کیبرے شو دیکھنے کے لیے پہنچ گیا اور اسے واقعی وہ دیکھنے کو ملا جو اسے نہیں دیکھنا تھا، یعنی اپنا باپ۔ اب آپ خیال کریں کہ ہم خود جھوٹ بول کر اور جھوٹی نصیحت کر کے اپنے بچوں کو کیا سکھا رہے ہیں۔ وہ ہمارے طرزِ عمل سے جھوٹ بولنے اور غلط راہ اختیار کرنے کی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ ہم اپنے بچوں سے جھوٹے وعدے بھی کرتے ہیں اور اسے اس طرح ہم ان کے ذہن میں نقش کر دیتے ہیں کہ سچائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

والدین کو خواہ ان کے بچے کتنے ہی نیک اور اچھے کیوں نہ ہوں اپنے بچوں کے ماحول اور ان کی سوسائٹی سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اگر ان کے بچے صاف ستھرے رہتے ہیں، وہ فرمانبردار ہیں، سچ بولتے ہیں، گالی گلوچ سے پرہیز کرتے ہیں، چغل خوری نہیں کرتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ والدین مطمئن بیٹھیں۔ اگر آس پاس کا ماحول خراب ہے تو بچوں کو خطرے سے باہر نہیں سمجھنا چاہیے۔ آپ کو ان کے ماحول کی نگرانی کرنی پڑے گی۔ صرف اپنے بچوں کی اصلاح ایک طرح کی ناکام خودغرضی ہوگی بلکہ آپ جہاں اپنے بچوں کا خیال رکھیں وہاں پڑوسیوں کے بچوں کی اخلاقی نگہداشت سے بھی غافل نہ رہیں۔ آپ اس بات کی بھی کوشش کریں کہ بچوں میں ذات پرستی، فرقہ پرستی اور تنگ نظری کو بڑھاوا نہ ملے۔ کیونکہ آج ملک کے تعلیمی اداروں میں، خاص کر تاریخ کی جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں وہ فرقہ پرستی اور تنگ نظری کو بڑھاوا دینے والی ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرین تعلیم کے تعاون کی ضرورت ہے۔ وہ موجودہ نصاب تعلیم میں سدھار لائیں اور اس پر کڑی نگاہ رکھیں۔ تاریخ کی کتابیں ایسی تیار کی جائیں جن میں فرقہ واریت اور تنگ نظری کو بڑھاوا نہ دیا گیا ہو بلکہ حب الوطنی اور ملک کی خوشحالی اور ترقی کی کوششوں کو اجاگر کیا گیا ہو۔ والدین اپنے بچوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کریں تاکہ گھر اور معاشرے کی بھلائی بچے کے جذبات کا مرکز بن سکے اور بڑا ہو کر وہ پوری قوم کو اپنی توجہ کا مرکز بنا سکے۔ اگر بچہ مختلف مذاہب، نسلوں اور فرقوں کے ساتھ مل جل کر رہنا سیکھ لے گا تو اس کے دل میں اپنے خاندان اور سماج کی بہتری کا خیال پیدا ہوگا۔ اپنے خاندان اور سماج کی خامیوں اور خرابیوں کا احساس ہوگا اور ان خامیوں اور خرابیوں کو دور کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔

□□□

Aashyana Benaulia,
Biharsharif
Nalanda-803101
(Bihar)

سید فضل اللہ مکرم

درخواست نویسی کے رہنما اصول

درخواست کے لغوی معنی التماس یا گزارش کے ہیں۔ درخواست کو عرضی بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے Application کہتے ہیں۔ سوال کرنا، کسی خواہش یا کسی آرزو کا اظہار بھی درخواست ہے۔ درخواست نویسی سے مراد اپنی ضرورت یا طلب کو تحریری طور پر متعلقہ شخص تک پہنچانے کا عمل ہے۔ درخواست کی زبان اور لب ولہجہ آپ کی ضرورت یا خواہش کی شدت کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہی لب ولہجہ شخصیت کی شناخت کرواتا ہے۔

درخواست نویسی کی ضرورت اور اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ جب تک انسان کی خواہشات اور ضروریات باقی رہیں گی تب تک درخواست نویسی کا عمل جاری رہے گا۔ آپ کو ایسے کئی مواقع پیش آئیں گے جب آپ درخواست تحریر کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ کالج میں داخلہ چاہیے تو درخواست لکھنی پڑتی ہے۔ کالج سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو تو درخواست، ملازمت کے لیے درخواست اور استعفیٰ کے لیے درخواست، بینک میں اکاؤنٹ کھولنا یا بند کرنا ہو تو درخواست، گھر کے قریب کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہو تو درخواست، پانی یا بجلی کی صحیح فراہمی نہ ہو تو درخواست، زندگی کا ایسا کون سا شعبہ ہے جہاں درخواست کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو۔ کام چھوٹا ہو کہ بڑا، ضرورت عظیم ہو کہ حقیر، آپ کو درخواست تحریر کرنی ضروری ہوجائے گی۔ بعض محکمے درخواست کے بغیر کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ زبانی درخواست غیر معتبر تصور کی جاتی ہے۔

آج کا دور ابلاغیات کا دور ہے، رابطۂ عامہ کا دور ہے۔ مختلف افراد اور اداروں سے رابطہ رکھے بغیر تجارت یا ملازمت میں استحکام ممکن نہیں ہے۔ دوسروں کی صلاحیتوں سے واقف ہونا اور اپنی قابلیتوں کا اظہار کرنا، ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ درخواست نویسی سے شعوری اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے سے واقف ہونے اور اپنے آپ کو بہتر طور پر پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ آج کل ای میل کے ذریعے درخواستیں ارسال کرنے میں سہولت واقع ہوئی ہے۔ ذرائع ابلاغ خواہ کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوجائیں لیکن درخواست نویسی کا فن اپنی جگہ رہے گا۔ درخواست نویسی ایک فن ہے اور ہر فن اپنی جگہ مشکل ہوتا ہے۔ تھوڑی سی توجہ اور مشق کے ذریعے اس فن پر عبور حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہر فن کی طرح یہ بھی تخلیقی اظہار چاہتا ہے۔ درخواست لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے اور اس ضمن میں کوئی لاپروائی یا کنجوسی کا مظاہرہ نہ کیجیے۔ پرانے یا زرد کاغذ پر اور روانی سے نہ چلنے والے قلم سے لکھی ہوئی تحریر آپ کی شخصیت کو مجروح کرسکتی ہے۔ نہ صرف کاغذ بلکہ لفافہ بھی معیاری اور نفیس ہونا چاہیے۔

عرضی لکھنے سے قبل ایک خاکہ بنائیں کہ آپ کو کیا لکھنا ہے اور کس طرح لکھنا ہے، کون سے پہلوؤں کو روشن کرنا ہے اور مدعا کو کتنے لفظوں میں بیان کرنا ہے۔ خاکہ صحیح ڈھنگ سے عرضی لکھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ عرضی کی پہلی اور بڑی خصوصیت اس کی صداقت ہے۔ جو کچھ معلومات دی جائیں وہ بالکل صحیح ہوں۔ اپنی قابلیت کی دھونس جمانے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہ لیں۔ گول مول باتیں بنا کر صداقات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ ایسا کرنے سے آپ کی شخصیت بے اعتبار ہوجائے گی اور آپ کو فائدے کے بجائے نقصان اٹھانا پڑے گا۔

موثر ابلاغ کی تین بڑی خوبیاں ہیں۔ سلاست، وضاحت اور اختصار۔! سلیس زبان کا مطلب صحیح الفاظ کا انتخاب اور ان کا استعمال ہے۔ سلیس اور با محاورہ زبان لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ زبان میں سلاست اور سادگی پیدا کرتا ہے۔ تحریر میں سلاست کے اوصاف اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب الفاظ آسان اور جملے مختصر ہوں۔ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب ترسیل میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً یہ جملہ دیکھیے۔

''غدودانِ معدہ میں حالتِ خانہ جنگی سی ہے۔''

اگر اسی بات کو آسان لب ولہجے میں بیان کرنا ہوتا تو جملہ یوں ہوتا ہے۔

''معدہ صاف نہیں ہے۔''

مشکل الفاظ اور مبہم تراکیب کا استعمال کر کے قابلیت کا مظاہرہ کرنا بے وقوفی ہے۔ کچھ لوگ ادق اور غیر مانوس الفاظ کو استعمال کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ آپ جس جذبے یا تاثر سے عرضی لکھ رہے ہیں عرضی پڑھنے والا بھی کم وبیش وہی تاثر قبول کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ نے ابلاغ کا فریضہ انجام دے دیا۔

بہترین عرضی کی ایک اور خصوصیت اس کا واضح ہونا ہے۔ آپ جو کچھ لکھیں وہ واضح ہو۔ کوئی لفظ یا کوئی جملہ ناقابلِ فہم نہ ہو۔ نہ صرف لفظوں کا انتخاب صحیح ہو بلکہ ان کی دروبست بھی چست ہو۔ عرضی کو لفظی اور معنوی سطح پر قابلِ فہم ہونا چاہیے تاکہ آپ کی ضرورت یا خواہش کا واضح اظہار ہو۔ غیر واضح جملے درخواست کو ناقابلِ فہم بنا دیتے ہیں اور اس کے تاثر کی شدت کو کم کردیتے ہیں ایسے دو جملے ملاحظہ ہوں۔

غیر واضح: روزنامہ ''ریاست'' اخبار کے اشتہار میں آپ کی یونی ورسٹی کا

اشتہار دیکھا۔

واضح : روزنامہ ''ریاست'' میں یونی ورسٹی کا اشتہار دیکھا۔

غیر واضح: شب برات کی رات کو آبِ زم زم کا پانی پینا چاہیے۔

واضح: شب برات کو آبِ زم زم پینا چاہیے۔

املا کی غلطیاں بھی عرضی کو مبہم اور نا قابلِ قرأت بنا دیتی ہیں۔ مطالعے کی کمی سے یہ غلطی سرزد ہوتی ہے جس سے افسر پر غلط اثر پڑتا ہے۔ کوشش کیجیے کہ املا درست ہو۔ کچھ لوگوں کا اپنا تکیہ کلام ہوتا ہے وہ اپنی تحریروں میں بھی اس کو استعمال کر جاتے ہیں۔ تکیہ کلام کے استعمال سے درخواست مبہم ہو جاتی ہے اور عرضی پڑھنے والا جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

درخواست نویسی کی ایک اور خوبی اختصار ہے یعنی کم سے کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرنا۔ دفاتر کو عموماً روزانہ کئی درخواستیں موصول ہوتی ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر درخواست کا تفصیلی مطالعہ کیا جا سکے۔ اگر درخواست غیر ضروری طویل ہو اور اغلاط سے پُر ہو اور مدعا واضح نہ ہو تو وہ درخواست ابتدائی مرحلے میں روک لی جاتی ہے۔ اس لیے عرضی میں غیر ضروری الفاظ، تکرار و اعادہ، حشو وزوائد کا استعمال نامناسب ہے۔ ''تکرار و اعادہ'' کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

''میں ایس ایس سی میں درجۂ اوّل سے کامیاب ہوں۔ انٹرمیڈیٹ درجۂ اول سے کامیاب ہوں اور بی اے بھی فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوں یعنی ہر امتحان میں درجۂ اوّل سے کامیاب ہوا ہوں کبھی فیل نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ درجۂ اول سے ہی کامیاب ہوتا آیا ہوں۔''

اس قدر طویل عبارت کو جامع انداز میں یوں لکھا جا سکتا ہے:

''میں ایس ایس سی، انٹرمیڈیٹ اور بی اے، درجۂ اوّل سے کامیاب ہوں۔''

طوالت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

''رجسٹرار صاحب کی خدمت میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، مجھے امید ہے کہ وہ میری درخواست قبول کریں گے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایم اے امتحان کی فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ کیا ہے؟ میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ آخری تاریخ 28 اپریل ہے جب کہ ایک اور دوست نے 2/مئی بتایا ہے۔ آخر اس میں سچ کیا ہے؟ اس سے پہلے بھی یہ سوال کرنا چاہ رہا تھا مگر نہیں کر پایا۔ آپ سے ایک بار پھر گزارش ہے کہ فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ معلوم کرائیں تو نوازش ہوگی۔ آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

اسی عبارت کو مختصر اور جامع انداز میں اس طرح لکھا جا سکتا ہے۔

''ایم اے امتحان کی فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ سے مطلع کریں تو نوازش ہوگی۔''

درخواست کو مختصر اور جامع بنانے میں رموز اوقاف کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ سکتہ، وقفہ، تفصیلیہ، سوالیہ، ندائیہ، فجائیہ، واوین، خط اور ختمہ کی علامتوں کے استعمال سے تحریر کو مبسوط اور مربوط بنایا جا سکتا ہے۔

آج کل ملازمت کے لیے کسی خاص عرضی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے کیوں کہ ہر ادارہ اپنا مخصوص پروفارما رکھتا ہے۔ امیدوار کو صرف خانہ پُری کرنی ہوتی ہے۔ البتہ بعض ادارے بائیوڈاٹا طلب کرتے ہیں۔ اب بائیوڈاٹا بھی قدیم اصطلاح ہوگئی ہے۔ اس کی جگہ سی وی (c.v) کا استعمال عام ہوگیا ہے جسے Curriculum Vitae کہا جاتا ہے cv درخواست گزار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ سوجھ بوجھ سے تیار کی گئی cv بہترین کیریر کی ضامن ہوتی ہے۔

cv میں ذاتی معلومات جیسے نام، تاریخ پیدائش، سماجی رتبہ، زبان، مذہب، قومیت، پتہ بشمول موبائل نمبر اور ای میل پتہ بھی درج کیا جاتا ہے۔ تعلیمی پس منظر کے تحت تعلیمی ادارے کا نام، کورس کی مدت مع سال و سن، حاصل شدہ فیصد نمبر، ڈویژن، نمایاں کارکردگی، کمپیوٹر کی جان کاری وغیرہ جب کہ ملازمت کے تجربے کے تحت، ادارے کا نام مدت، عہدہ، تنخواہ، ذمہ داریاں، کارکردگی اور تربیتی پروگرام جن میں شرکت کی ہو؛ موجودہ ملازمت کی مکمل تفصیلات اور موجودہ آجر سے نو آبجکشن سرٹیفکیٹ وغیرہ کی مکمل تفصیلات درج کرنا ضروری ہے۔

cv کے مندرجات کی ترتیب ملازمت یا عہدے پر منحصر ہے۔ اگر آپ پہلی مرتبہ ملازمت کے لیے عرضی داخل کر رہے ہوں تو ذاتی معلومات ابتدا میں دی جائیں۔ پھر تعلیمی قابلیت اور تجربے کو شامل کیا جائے۔ اگر آپ پہلے سے ملازم ہوں اور کسی بڑے عہدے کے لیے امیدوار ہوں تو cv کو تعلیمی قابلیت یا تجربے کی تفصیل سے شروع کیا جائے cv میں خاندانی حالات ہرگز نہ دیں مختصر لفظوں میں اپنی پوری شخصیت کو پیش کریں۔ cv دو صفحات سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ اہم نکات کو اہمیت دیں۔ غیر ضروری طوالت سے گریز کریں۔

cv کے ساتھ ایک تعارفی یا تمہیدی خط بھی لکھا جاتا ہے۔ اس خط پر خصوصی توجہ دیں کیوں کہ یہ تمہیدی خط آپ کی تعلیمی لیاقت اور تجربے کا خلاصہ ہوتا ہے۔ خط جاذب نظر اور مختصر ہو، قواعد کی غلطیوں سے پاک ہو۔ جس شخص کو خط لکھ رہے ہوں اس کے نام کے ہجے پر خاص دھیان دیں۔ درخواست میں نہ تو بے جا عاجزی اور انکساری سے کام لیں اور نہ ہی تکبر اور گھمنڈ کا مظاہرہ کریں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ متعلقہ عہدے کے لیے آپ بہترین امیدوار ہیں اور ادارے کو ترقی دینے اور اس کے معیار کو بلند کرنے میں آپ معاون ہو سکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
16-9-505, Old Malakpet,
Hyderabad - 36 (A.P.)

قرۃ العین حیدر (ہماری مطبوعات سے)

مونالیزا

پریوں کی سرزمین کو ایک راستہ جاتا ہے شاہ بلوط اور صنوبر کے جنگلوں میں سے گزرتا ہوا جہاں روپہلی ندیوں کے کنارے چیری اور بادام کے سایوں میں خوب صورت چرواہے چھوٹی چھوٹی بانسریوں پر خوابوں کے نغمے الاپتے ہیں۔ یہ سنہرے چاند کی وادی ہے۔ Never Never Land کے مغرور اور خوب صورت شہزادے۔ پیٹر پین کا ملک جہاں ہمیشہ ساری باتیں اچھی اچھی ہوا کرتی ہیں۔ آئس کریم کی برف پڑتی ہے۔ چوکلیٹ اور پلم کیک کے مکانوں میں رہا جاتا ہے۔ موٹریں پٹرول کے بجائے چائے سے چلتی ہیں۔ بغیر پڑھے ڈگریاں مل جاتی ہیں۔

اور کہانیوں کے اس ملک کو جانے والے راستے کے کنارے کنارے بہت سے سائن پوسٹ کھڑے ہیں جن پر لکھا ہے "صرف موٹروں کے لیے"، "یہ عام راستہ نہیں" اور شام کے اندھیرے میں زناٹے سے آتی ہوئی کاروں کی تیز روشنی میں نرگس کے پھولوں کی چھوٹی سی پہاڑی میں سے جھانکتے ہوئے یہ الفاظ جگمگا اٹھتے ہیں: "پلیز آہستہ چلایئے — شکریہ!"

اور بہار کی شگفتہ اور روشن دوپہروں میں سنہرے بالوں والی کرلی لوکس، سنڈریلا اور اسنووائٹ چھوٹی چھوٹی پھولوں کی ٹوکریاں لے کر اس راستے پر چیری کے شگوفے اور ستارۂ سحری کی کلیاں جمع کرنے آیا کرتی تھیں۔

ایک روز کیا ہوا کہ ایک انتہائی ڈیشنگ شہ سوار راستہ بھول کر صنوبروں کی اس وادی میں آنکلا جو دور دراز کی سرزمینوں سے بڑے بڑے عظیم الشان معرکے سر کرکے چلا آرہا تھا۔ اس نے اپنے شان دار گھوڑے پر سے جھک کر کہا: "مائی ڈیئرینگ لیڈی کیسی خوش گوار صبح ہے!"

کرلی لوکس نے بے تعلقی سے جواب دیا: "اچھا، واقعی؟ تو پھر کیا ہوا؟"

شہ سوار کی خواب ناک آنکھوں نے خاموشی سے کہا: "پسند کرو ہمیں۔"

کرلی لوکس کی بڑی بڑی روشن اور نیلی آنکھوں میں بے نیازی جھلملا اٹھی۔

"جناب عالی ہم بالکل نوٹس نہیں لیتے۔" شہ سوار نے اپنی خصوصیات بتائیں۔ ایک شان دار سی امپیریل سروس کے مقابلے میں ٹاپ کیا ہے۔ اب تک ایک سو پینتیس ڈوئیل لڑ چکا ہوں۔ بہترین قسم کا Heart Breaker ہوں۔ کرلی لوکس نے غصے سے اپنی سنہری لٹیں جھٹک دیں اور اپنے بادامی ناخنوں کے برگنڈی کیوٹیکس کو غور سے دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔ سنڈریلا اور اسنووائٹ پگڈنڈی کے کنارے اسٹرابری چنتی رہیں۔

اور ڈیشنگ شہ سوار نے بڑے ڈرامائی انداز سے جھک کر نرسری کا ایک پرانا گیت یاد دلایا:

کرلی لوکس کرلی لوکس
یعنی اے میری پیاری چینی کی گڑیا۔
تمھیں برتن صاف کرنے نہیں پڑیں گے۔
اور بطخوں کو لے کر چراگاہ میں جانا نہیں ہوگا۔
بلکہ تم کشنوں پر بیٹھی بیٹھی اسٹرابری کھایا کروگی۔

اے میری سنہرے گھنگھریالے بالوں والی مغرور شہزادی ایمیلیا ہنری ایٹا مرایا —— دو نینا متوارے تمھارے ہم پر ظلم کریں۔

اور پھر وہ ڈیشنگ شہ سوار اپنے شان دار گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوسری سرزمینوں کی طرف نکل گیا جہاں اور بھی زیادہ عظیم الشان اور زبردست معرکے اس کے منتظر تھے اور اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازِ بازگشت پہاڑی راستوں اور وادیوں میں گونجتی رہی۔

پھر ایک اور بات ہوئی جس کی وجہ سے چاند کی وادی کے باسی غمگین رہنے لگے کیوں کہ ایک خوش گوار صبح معصوم کوک روبن ستارۂ سحری کے سبزے پر مقتول پایا گیا۔ مرحوم پر کسی ظالم نے تیر چلایا تھا۔ سنڈریلا رونے لگی۔ بے چارا میرا سرخ اور نیلے پروں والا گڈ و سا پرندہ۔ پرستان کی ساری چڑیوں، خرگوشوں اور گلہریوں نے مکمل تحقیق و تفتیش کے بعد پتا چلا لیا اور بالاتفاق رائے اس کی بے وقت اور جوان مرگی پر تعزیت کی قرارداد منظور کی گئی۔ یونی ورسٹی میں

"آئینۂ جہاں (جلد اول)" (کلیات قرۃ العین حیدر) سے ماخوذ، مرتب: ڈاکٹر جمیل اختر، ضخامت 600 صفحات، قیمت : -/266

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

کوک روبن ڈے منایا گیا لیکن عقل مند پوسی کیٹ نے، جو فل بوٹ پہن کر ملکہ سے ملنے لندن جایا کرتی تھی، سنڈریلا سے کہا: ''روؤ مت میری گڑیا، یہ کوک روبن تو یوں ہی مرا کرتا ہے اور پھر فرسٹ ایڈ ملتے ہی فوراً زندہ ہو جاتا ہے۔''

اور کوک روبن سچ مچ زندہ ہو گیا اور پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اور ہمیشہ کی طرح وادی کے سبزے پر بکھرے ہوئے بھیڑوں نے گلے کی ننھی منّی گھنٹیاں اور دور سمندر کے کنارے شفق میں کھوئے ہوئے پرانے عبادت خانوں کے گھنٹے آہستہ آہستہ بجتے رہے — ڈنگ ڈونگ، ڈنگ ڈونگ بل، پوسی ان دَ ویل۔

ڈنگ ڈونگ۔ ڈنگ ڈونگ — جیسے کرلی لوکس کہہ رہی ہو: نہیں، نہیں، نہیں، نہیں!

اور اس نے کہا۔ نہیں نہیں۔ یہ تو پریوں کے ملک کی باتیں تھیں۔ میں کوک روبن نہیں ہوں، نہ آپ کرلی لوکس یا سنڈریلا ہیں۔ ناموں کی ٹوکری میں سے جو پرچی میرے ہاتھ پڑی ہے اس پر ریٹ بٹلر لکھا ہے لہٰذا آپ کو اسکارلٹ اوہارا ہونا چاہیے۔ ورنہ اگر آپ جولیٹ یا کلیوپٹرا ہیں تو رومیو یا انطونی صاحب کو تلاش فرمایئے اور میں قاعدے سے مس اوہارا کی فکر کروں گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ جولیٹ یا بیٹرس یا ماری انطونی نہیں ہیں اور میں قطعی ریٹ بٹلر نہیں ہو سکتا، کاش آپ محض آپ ہوتیں اور میں صرف میں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا آیئے اپنی اپنی تلاش شروع کریں۔

— ہم سب کے راستے یوں ہی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے پھر الگ الگ چلے جاتے ہیں، لیکن پرستان کی طرف تو ان میں سے کوئی راستہ بھی نہیں جاتا۔

— چوکو بارز کی اسٹالوں اور لکی ڈپ کے خیمے کے رنگین دھاری دار پردوں کے پیچھے چاندی کی ننھی منی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ ڈنگ ڈونگ ڈنگ ڈونگ — پوسی بے چاری کنویں میں گر گئی اور ٹوم اسٹاؤٹ بے فکری سے چوکو بارز کھاتا رہا۔ پھر وہ سب زندگی کی ٹریجڈی میں غور کرنے میں مصروف ہو گئے کیوں کہ وہ چاند کی وادی کے باسی نہیں تھے لیکن اتنے احمق تھے کہ پرستان کی پگڈنڈی پر موسمِ گل کے پہلے سفید شگوفے تلاش کرنے کی کوشش کر لیا کرتے تھے اور اس کوشش میں انھیں ہمیشہ کسی نہ کسی اجنبی ساحل، کسی نہ کسی ان دیکھی، ان جانی چٹان پر فورسڈ لینڈنگ کرنی پڑتی تھی۔ وہ کئی تھے۔ ڈک وٹنگٹن جسے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی تو اسے فل بوٹ پہننے والی وہ پوسی کیٹ مل ہی جائے گی جو اسے خوابوں کے شہر کی طرف اپنے ساتھ لے جائے اور اسے یقین تھا کہ خوابوں کے شہر میں ایک نیلی آنکھوں والی ایلس اپنے ڈرائنگ روم کے آتش دان کے سامنے بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی ہے اور وہ افسانہ نگار جو سوچتا تھا کہ کسی روپہلے راج ہنس کے پروں پر بیٹھ کر اگر وہ زندگی کے اس پار کہانیوں کی سرزمین میں پہنچ جائے جہاں چاند کے قلعے میں خیالوں کی شہزادی رہتی ہے تو وہ اس سے کہے: ''میری مغرور شہزادی! میں نے تمھارے لیے اتنی کہانیاں، اتنے اوپیرا اور اتنی نظمیں لکھی ہیں۔ میرے ساتھ دنیا کو چلو تو دنیا کتنی خوب صورت، زندہ رہنے اور محبت کرنے کے قابل جگہ بن جائے۔'' لیکن روپہلا راج ہنس اسے کہیں نہ ملتا تھا اور وہ اپنے باغ میں بیٹھا بیٹھا کہانیاں اور نظمیں لکھا کرتا تھا اور جو خوب صورت اور عقل مند لڑکی اس سے ملتی اسے ایک لمحے کے لیے یقین ہو جاتا کہ خیالوں کی شہزادی چاند کے ایوانوں میں سے نکل آئی ہے لیکن دوسرے لمحے یہ عقل مند لڑکی ہنس کر کہتی کہ اُفوہ بھئی فن کار صاحب! کیا cynicism بھی اس قدر الٹرا فیشن ایبل چیز بن گئی ہے اور آپ کو یہ مغالطہ کب سے ہو گیا ہے کہ آپ جینیئس بھی ہیں اور اس کے نقرئی قہقہے کے ساتھ چاند کی کرنوں کی وہ ساری سیڑھیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑتیں جن کے ذریعے وہ اپنی نظموں میں خیالستان کے محلوں تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور دنیا ویسی کی ویسی ہی رہتی — اندھیری، ٹھنڈی اور بدصورت — اور سنڈریلا جو ہمیشہ اپنا ایک بلوریں سینڈل رات کے اختتام پر خوابوں کی جھلملاتی رقص گاہ میں بھول آتی تھی، اور وہ ڈیشنگ شہ سوار جو پرستان کی خاموش، شفق کے رنگوں میں کھوئی ہوئی پگڈنڈیوں پر اکیلے اکیلے ہی ٹہلا کرتا تھا اور برف جیسے رنگ اور سرخ انگارہ جیسے ہونٹوں والی اسنو وائٹ جو رقص کرتی تھی تو بوڑھے بادشاہ کول کے دربار کے تینوں پری زاد مغنی اپنے وائلن بجانا بھول جاتے تھے۔

''اور''، ریٹ بٹلر نے اس سے کہا، ''مس اوہارا آپ کو کون سا رقص زیادہ پسند ہے۔ ٹینگو — فوکس ٹروٹ — رومبا — آیئے لیمبتھ واک کریں۔''

اور افروز اپنے پارٹنر کے ساتھ رقص میں مصروف ہو گئی حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسکارلٹ اور ہارا نہیں ہے کیوں کہ وہ چاند کی دنیا کی باسی نہیں تھی۔ سبزے پر رقص ہو رہا تھا۔ روش کی دوسری طرف ایک درخت کے نیچے، لکڑی کے عارضی پلیٹ فارم پر چارلس جوڈا کا آرکیسٹرا اپنی پوری سوئنگ میں تیزی سے بج رہا تھا — اور پھر ایک دم سے قطعے کے دوسرے کنارے پر ایستادہ لاؤڈ اسپیکر میں کارمن میرانڈا کا ریکارڈ چیخنے لگا: ''تم آج کی رات کسی کے بازوؤں میں ہونا چاہتی ہو؟'' لکی ڈپ اور ''عارضی کافی ہاؤس'' کے رنگین خیموں پر بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بجتی رہیں اور کسی نے اس کے دل میں آہستہ آہستہ کہا: موسیقی — دیوانگی — زندگی — دیوانگی — شوپاں کے نغمے — ''چیپی مون'' اور خدا!! اس نے اپنے ہم رقص کے مضبوط، پر اعتماد، مغرور بازوؤں پر اپنا بوجھ ڈال کر ناچ کے ایک کوئیک اسٹیپ کا ٹرن لیتے ہوئے اس کے شانوں پر دیکھا۔ سبزے پر اس جیسے کتنے انسان

اس کی طرح دو دو کے رقص کی ٹکڑیوں میں منتشر تھے۔ ''جولیٹ'' اور ''رومیو''، ''وکٹوریہ'' اور ''البرٹ''، ''بیٹرس'' اور ''دانتے'' ایک دوسرے کو خوب صورت دھوکے دینے کی کوشش کرتے ہوئے، ایک دوسرے کو غلط سمجھتے ہوئے اپنی اس مصنوعی، عارضی، چاند کی وادی میں کتنے خوش تھے وہ سب کے سب--! بہار کے پہلے شگوفوں کی متلاشی اور کاغذی کلیوں پر قانع اور مطمئن-- زندگی کے تعاقب میں پریشان وسرگرداں زندگی--مُمہ-- شوپاں کی موسیقی، سفید گلاب کے پھول، اور اچھی کتابیں۔ کاش! زندگی میں صرف یہی ہوتا، چاند کی وادی کے اس افسانہ نگار اویناش نے ایک مرتبہ اس سے کہا تھا۔ مُمہ-- کتنا بنتے ہو اویناش! ابھی سامنے سے ایک خوب صورت لڑکی گزر جائے اور تم اپنی ساری تخیل پرستیاں بھول کر سوچنے لگو گے کہ اس کے بغیر تمھاری زندگی میں کتنی بڑی کمی ہے-- اور اویناش نے کہا تھا: کاش جو ہم سوچتے وہی ہوا کرتا، جو ہم چاہتے وہی ملتا-- ہائے یہ زندگی کا لکی ڈپ--! زندگی، جس کا جواب مونالیزا کا تبسم ہے جس میں نرسری کے خوب صورت گیت اور چاند ستارے ترشتی ہوئی کہانیاں تمھارا مذاق اُڑاتی تمھارا منہ چڑاتی بہت پیچھے رہ جاتی ہیں جہاں کوک روبن پھر سے زندہ ہونے کے لیے روز نئے نئے تیروں سے مرتا رہتا ہے-- اور کرلی لوکس ریشمیں کشنوں کے انبار پر کبھی نہیں چڑھ پاتی۔ کاش افروز تم-- اور پھر وہ خاموش ہو گیا تھا کیوں کہ اسے یاد آگیا تھا کہ افروز کو ''کاش''-- اس سستے اور جذباتی لفظ سے سخت چڑ ہے۔ اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے تمھیں خود پر اعتماد، بھروسہ، یقین نہیں۔

اور افروز لیمبتھ واک کی اچھل کود سے تھک گئی۔ کیسا بے ہودہ سا ناچ ہے۔ کس قدر بے معنی اور فضول سے Steps ہیں۔ بس اچھلتے اور گھومتے پھر رہے ہیں، بے وقوفوں کی طرح۔

''مس اوہارا--'' اس کے ہم رقص نے کچھ کہنا شروع کیا۔

''--افروز سلطانہ کہیے۔''

''اوہ-- مس افروز حمید علی-- آیئے کہیں بیٹھ جائیں۔''

''بیٹھ کر کیا کریں؟''

''ار--باتیں!''

''باتیں آپ کر ہی کیا سکتے ہیں سوائے اس کے کہ مس حمید علی آپ یہ ہیں، آپ وہ ہیں، آپ بے حد عمدہ رقص کرتی ہیں، آپ نے کل کے سنگلز میں پرکاش کو خوب ہرایا--''

''ار-- غالباً آپ کو سیاسیات سے--''

''شکریہ اویناش اس کے لیے ضرورت سے زیادہ ہے۔''

''اچھا تو پھر موسیقی یا پال مُنی کی نئی فلم--''

''مختصر یہ کہ آپ خاموش کسی طرح نہیں بیٹھ سکتے--'' وہ چپ ہو گیا۔

پھر شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ درختوں میں رنگ برنگے برقی قمقمے جھلملا اٹھے اور وہ سب سبزے کو خاموش اور سنسان چھوڑ کے بال روم کے اندر چلے گئے۔ آرکیسٹرا کی گت تبدیل ہو گئی۔ جاز اپنی پوری تیزی سے بجنے لگا۔ وہ ہال کے سرے پر شیشے کے لمبے لمبے دریچوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے قریب اس کی ممانی کا چھوٹا بھائی، جو کچھ عرصے قبل امریکہ سے واپس آیا تھا، میری ووڈ سے باتیں کرنے میں مشغول تھا اور بہت سی لڑکیاں اپنی سبز بید کی کرسیاں اس کے آس پاس کھینچ کر انتہائی انہماک اور دل چسپی سے باتیں سن رہی تھیں اور میری ووڈ ہنسے جا رہی تھی۔ میری ووڈ، جو سانولی رنگت کی بڑی بڑی آنکھوں والی ایک اعلیٰ خاندان عیسائی لڑکی اور انگریز کرنل کی بیوی تھی، ایک ہندوستانی فلم میں کلاسیکل رقص کر چکی تھی اور اب جاز کی موسیقی اور شیری کے گلاسوں کے سہارے اپنی شامیں گزار رہی تھی۔

اور پایپوں اور سگرٹوں کے دھوئیں کا ملا جلا لرزتا ہوا عکس بال روم کی سبز روغنی دیواروں پر بنے ہوئے طیاروں، پام کے درختوں اور رقصاں اپسراؤں کے دھندلے دھندلے نقوش کو اپنی لہروں میں لپیٹتا، ناچتا، رنگین اور روشن چھت کی بلندی کی طرف اٹھتا رہا۔ خوابوں کا شبنم آلود سحر آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔

اور یک لخت، میری ووڈ نے زور سے ہنسنا اور چلانا شروع کر دیا۔ افروز کی ممانی کے ہالی ووڈ پلٹ بھائی نے ذرا گھبرا کر اپنی کرسی پیچھے کو سرکا لی۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ آرکیسٹرا کے سُر آہستہ آہستہ ڈوبتے گئے اور دبی دبی اور مدھم قہقہوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ وہ سبز آنکھوں والی زرد رو لڑکی، جو بہت دیر سے ایک ہندوستانی پرنس کے ساتھ ناچ رہی تھی، تھک کر افروز کے قریب آکر بیٹھ گئی اور اس کا باپ، جو ایک ہندوستانی ریاست کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا، فرن کے پتوں کے پیچھے گیلری میں بیٹھا اطمینان سے سگار کا دھواں اڑاتا رہا۔

پھر کھیل شروع ہوئے اور ایک بے حد اوٹ پٹانگ سے کھیل میں حصہ لینے کے لیے سب دوبارہ ہال کی فلور پر آگئے اور افروز کا ہم رقص ریٹ بٹلر اپنے خواب ناک آنکھوں والے دوست کے ساتھ اس کے قریب آیا: ''مس حمید علی آپ میری پارٹنر ہیں نا؟''

''جی ہاں۔ آیئے۔''

اور اس خواب ناک آنکھوں والے دوست نے کہا: ''بارہ بجنے والے ہیں۔ نیا سال مبارک ہو۔ لیکن آج اتنی خاموش کیوں ہیں آپ؟''

''آپ کو بھی مبارک ہو لیکن ضرورت ہے کہ اس زبردست خوشی میں خواہ مخواہ کی بے کار باتوں کا سلسلہ رات بھر ختم ہی نہ کیا جائے۔''

''لیکن میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اس طرح خاموش نہ رہیں۔ اس سے

خواہ مخواہ یہ ظاہر ہوگا کہ آپ کو اس مجمعے میں ایک مخصوص شخص کی موجودگی ناگوار گزر رہی ہے۔''

''پر جو آپ چاہیں لازم تو نہیں کہ دوسروں کی بھی وہی مرضی ہو۔ کیوں کہ جب آپ کچھ کہتے ہوتے ہیں اُس وقت آپ کو یقین ہوتا ہے کہ ساری دنیا بے حد دلچسپی سے آپ کی طرف متوجہ ہے اور بعد میں لڑکیاں کہتی ہیں: افوہ! کس قدر مزے کی باتیں کرتے ہیں انور صاحب۔

اتنے میں پرکاش کاغذ اور پنسلیں تقسیم کرتی ہوئی ان کی طرف آئی اور ان کو ان کے فرضی نام بتاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے سب چپ ہوگئے۔ پھر قہقہوں کے شور کے ساتھ کھیل شروع ہوا کھیل کے دوران میں اس نے اپنی خواب ناک آنکھیں اٹھا کر یوں ہی کچھ نہ کچھ بولنے کی غرض سے پوچھا: ''جی، تو ہم کیا باتیں کر رہے تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ ہم باتیں قطعی کر ہی نہیں رہے تھے۔ کیوں نہ آپ قاعدے سے اپنی پارٹنر کے ساتھ جا کر کھیلیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں اسکارلٹ اوہارا ہوں۔ جولیٹ ابھی آپ کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر مہرہ اور اوبناش اس کی طرف آ گئے اور وہ ان کے ساتھ کھیل میں مصروف ہوگئی۔

اور جب رات کے اختتام پر وہ رفعت کے ساتھ اپنا اوورکوٹ لینے کے لیے کلوک روم کی طرف جا رہی تھی تو گیلری کے سامنے کی طرف سے گزرتے ہوئے اس نے اس سبز آنکھوں والی زرد رو جولیٹ کے باپ کو اپنے دوستوں سے کہتے سنا: ''آپ میرے داماد میجر بھنڈاری سے ملے؟ مجھے تو فخر ہے کہ میری بڑی لڑکی نے اپنے فرقے سے باہر شادی کرنے میں ذات اور مذہب کی دقیانوسی قیود کی پروا نہیں کی۔ میری لڑکی کا انتخاب پسند آیا آپ کو؟ ہی ہی ہی۔ دراصل میں نے اپنی چاروں لڑکیوں کا ٹیسٹ کچھ اس طرح Cultivate کیا ہے کہ پچھلی مرتبہ جب میں ان کو اپنے ساتھ یورپ لے گیا تو—'' اور افروز جلدی سے بال روم کے باہر نکل آئی۔ یہ زندگی— یہ زندگی کا گھٹیا پن!

واقعی—! یہ زندگی—!!

اور جشن نوروز کے دوسرے دن اس بے چارے ریٹ بٹلر نے اپنے دوست، اس خواب ناک آنکھوں والے ڈیشنگ شہ سوار سے کہا، جو پرستان کے راستوں پر سب سے الگ الگ ٹہلا کرتا تھا— ''عجب لڑکی ہے بھئی۔''

''ہوا کرے۔'' اور وہ خواب ناک آنکھوں والا دوست بے نیازی سے سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا بنا کر چھت کی طرف بھیجتا رہا۔

اور اس عجیب لڑکی کی دوست کہہ رہی تھی: ''ہُنہ، اس قدر مغرور، مغالطہ فائیڈ قسم کا انسان۔''

''ہوا کرے بھئی۔ ہم سے کیا۔'' اور افروز بے تعلقی کے ساتھ ٹنگ میں مصروف ہوگئی۔

''اتنی اونچی بننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟'' رفعت نے چڑ کر پوچھا۔

''کیا ہرج ہے۔''

''کوئی ہرج ہی نہیں؟ قسم خدا کی افروز اس اوبناش کے فلسفے نے تمھارا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

''تو گویا تمھارے لیے زنجیر ہلائی جائے۔''

''فوہ۔ جیسے آپ یوں ہی نولفٹ جاری رکھیں گی۔''

''قطعی— ! زندگی تمھارے لیے ایک مسلسل جذباتی اضطراب ہے لیکن مجھے اصولوں میں رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے— جانتی ہو زندگی کے یہ ایئر کنڈیشنڈ اصول بڑے کارآمد اور محفوظ ثابت ہوتے ہیں۔''

''فیبہ— کیا بلند پروازی ہے۔''

''میں؟''

''تم اور وہ— خدا کی قسم ایسی بے پروائی سے بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ جی چاہتا ہے پکڑ کر کھا جاؤں اسے۔ جھکنا جانتا ہی نہیں جیسے۔''

''ارے چپ رہو بھائی۔''

''سچ مچ اس کی آنکھوں کی گہرائیاں اتنی خاموش، اس کا انداز اتنا پُروقار، اتنا بے تعلق ہے کہ بعض مرتبہ جی میں آتا ہے کہ بس خودکشی کر لو۔ یعنی ذرا سوچو تو، تم جانتی ہو کہ تمھارے کشن کے نیچے یا مسہری کے سرہانے میز پر بہترین قسم کی کیڈبری چاکلیٹ کا بڑا سا خوب صورت پیکٹ رکھا ہوا ہے لیکن تم اسے کھا نہیں سکتیں— اُف!''

''کون بھئی—؟'' پرکاش نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی نہیں— ہے— ایک— ایک—'' رفعت نے اپنے غصے کے مطابقت میں کوئی موزوں نام سوچنا چاہا۔

''— بلا—'' افروز نے اطمینان سے کہا۔

''بلا!'' پرکاش کافی پریشان ہوگئی۔

''ہاں بھئی— ایک بلا ہے بہت ہی Typical قسم کا ایرانی بلا۔'' افروز بولی۔

''تو کیا ہوا اس کا؟'' پرکاش نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ہوتا کیا؟ سب ٹھیک ہے بالکل۔ بس ذرا اسے اپنی آنکھوں پر بہت ناز ہے اور ان مسعود اصغر صاحب کا کیا ہوگا؟ جو مسوری سے مار خط پہ خط نہایت اسٹائلش انگریزی میں تمھارے ٹینس کی تعریف میں بھیجا کرتے ہیں۔''

''ان کو تار دے دیا جائے— Nose upturned-Nose upturned-Riffat:

"ہاں۔ یعنی لفٹ نہیں دیتے۔ جس کی ناک ذرا اوپر کو اٹھی ہوتی ہے وہ آدمی ہمیشہ بے حد مغرور اور خود پسند طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔"

"تو تمھاری ناک اتنی اٹھی ہوئی کہاں ہے۔"

"قطعی اٹھی ہوئی ہے۔ بہترین پروفائل آتا ہے۔"

"واقعی ہم لوگ بھی کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔"

"جناب، بے حد مفید اور عقل مندی کی باتیں ہیں۔"

"اور صلاح الدین بے چارہ!"

"وہ تو پیدا ہی نہیں ہوا اب تک۔" رفعت نے بڑے رنجیدہ انداز سے کہا۔

کیوں کہ یہ ان کا تخئیلی کردار تھا اور خیالستان کے کردار چاند کی وادی میں سے کبھی نہیں نکلتے۔ جب کبھی وہ سب کسی پارٹی میں ملیں تو سب سے پہلے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ایک دوسرے سے اس فرضی ہستی کی خیریت پوچھی جاتی، اس کے متعلق اوٹ پٹانگ باتیں کی جاتیں اور اکثر انھیں محسوس ہوتا جیسے انھیں یقین سا ہو گیا ہے کہ ان کا خیالی کردار اگلے لمحے ان کی دنیا اور ان کی زندگی میں داخل ہو جائے گا۔

اور فرصت اور بے فکری کی ایک خوش گوار شام انھوں نے یوں ہی باتیں کرتے کرتے صلاح الدین کی اس خیالی تصویر کو مکمل کیا تھا۔ وہ سب شاپنگ سے واپس آکر منظر احمد پر زور شور سے تبصرہ کر رہی تھیں جو ان سے دیر تک آرٹس اینڈ کرافٹس ایمپوریم کے ایک کاؤنٹر پر باتیں کرتا رہا تھا اور پرکاش نے قطعی فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ بے حد بنتا ہے اور افروز بے حد پریشان تھی کہ کس طرح اس کا یہ مغالطہ دور کرے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔

"لیکن اسے لفٹ دینے کی کوئی معقول وجہ پیش کرو۔"

"کیوں کہ بھئی ہمارا معیار اس قدر بلند ہے کہ کوئی مارک تک پہنچ نہیں سکتا۔"

"لہٰذا اب کی بار اس کو بتا دیا جائے گا کہ بھئی افروز کی تو منگنی ہونے والی ہے۔"

"لیکن کس سے؟"

"یہی تو طے کرنا باقی ہے۔ مثلاً — مثلاً ایک آدمی سے۔ کوئی نام بتاؤ۔"

"پرویز۔"

"بڑا عام افسانوی سا نام ہے۔ کچھ اور سوچو!"

"سلامت اللہ!"

"ہش۔ بھئی واہ، کیا شان دار نام دماغ میں آیا — صلاح الدین!"

"یہ ٹھیک ہے۔ اچھا، اور بھائی صلاح الدین کا تعارف کس طرح کرایا جائے؟"

"بھئی صلاح الدین صاحب جو تھے وہ ایک روز پرستان کے راستے پر شفق کے گل رنگ سائے تلے مل گئے۔"

"پرستان کے راستے پر؟"

"چپکی سنتی جاؤ۔ جانتی ہو میں اس قدر بہترین افسانے لکھتی ہوں جن میں سب پرستان کی باتیں ہوتی ہیں۔ بس پھر یہ ہوا کہ —"

"جناب ہم تو اس دنیا کے باسی ہیں۔ پرستان اور کہانیوں کی پگڈنڈیوں پر تو صرف اویناش ہی بھٹکتا اچھا لگتا ہے۔"

"چچ چچ چچ۔ بے چارہ اویناش — گُڈ۔"

"بھئی ذکر تو صلاح الدین کا تھا۔"

"خیر تو جناب صلاح الدین صاحب پرستان کے راستے پر ہرگز نہیں ملے۔ وہ بھی ہماری دنیا کے باسی ہیں اور ان کا دماغ قطعی خراب نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ سب ہی میٹر آف فیکٹ طریقے سے۔"

"یہ ہوا کہ افروز دل کشا جا رہی تھی تو ریلوے کراسنگ کے پاس بے حد رومینٹک انداز سے اس کی کار خراب ہو گئی۔"

"نہیں بھئی واقعہ یہ تھا کہ افروز آفیسرز شاپ جو گئی ایک روز تو پتا چلا کہ وہ غلط تاریخ پر پہنچ گئی ہے، اور وہ اپنا کارڈ بھی گھر بھول گئی تھی۔ بس بھائی صلاح الدین جو تھے انھوں نے جب دیکھا کہ ایک خوب صورت لڑکی برگنڈی رنگ کا کیوٹکس نہ ملنے کے غم میں رو پڑنے والی ہے تو انھوں نے بے حد Gallantly آگے بڑھ کر کہا کہ "خاتون میرا آج کی تاریخ کا کارڈ بے کار جا رہا ہے، اگر آپ چاہیں۔"

"بہت ٹھیک۔ آگے چلو۔ پھر کیا ہونا چاہیے؟" "بس وہ پیش ہو گئے۔" نہ پیش نہ زیر نہ زبر — افروز نے فوراً نو لفٹ کر دیا اور بے چارے دل شکستہ ہو گئے۔"

"اچھا ان کا کیریکٹر —"

"بہت ہی بیش فُل۔"

"ہرگز نہیں۔ کافی تیز — لیکن بھئی ڈینڈی قطعی نہیں برداشت کیے جائیں گے۔"

"قطعی نہیں صاحب — اور اور فلرٹ ہوں تھوڑے سے —"

"تو کوئی مضائقہ نہیں — اچھا وہ کرتے کیا ہیں؟"

"بھئی ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کرتے ہوں گے!"

"آرمی میں رکھ لو —"

"اوّق — حد ہو گئی تمھارے اسسٹنٹ کی۔ کچھ سوال سروس وغیرہ

کالاؤ۔"

"سب بور ہوتے ہیں۔"

"ارے ہم بتائیں، کچھ کرتے کراتے نہیں۔ منظر احمد کی طرح تعلقہ دار ہیں۔ پچیس گاؤں اور ایک بڑی رومینٹک سی جھیل جہاں پر وہ کرسمس کے زمانے میں اپنے دوستوں کو مدعو کیا کرتے ہیں۔ ہاں اور ایک شان دار سی اسپورٹس کار—"

"لیکن بھئی اس کے باوجود بے انتہا قومی خدمت کرتا ہے۔ کیمونسٹ قسم کی کوئی مخلوق۔"

"کیمونسٹ ہے تو اسے اپنے پچیسوں گاؤں علاحدہ کر دینے چاہئیں کیوں کہ پرائیویٹ پراپرٹی—"

"واہ، اچھے بھائی بھی تو اتنے بڑے کیمونسٹ ہیں۔ انھوں نے کہاں اپنا تعلقہ چھوڑا ہے؟"

"آپ تو چغد ہیں نشاط زریں— اچھے بھیا تو سچ مچ کے آدمی ہیں۔ ہیرو کو بے حد آئیڈیل قسم کا ہونا چاہیے۔ یعنی غور کرو صلاح الدین محمود کس قدر بلند پایہ انسان ہے کہ جنتا کی خاطر—"

"افوہ— کیا بوریت ہے بھئی۔ تم سب مل کر ابھی یہی طے نہیں کر پائیں کہ وہ کرتا کیا ہے۔"

"کیا بات ہوئی ہے واللہ!"

"جلدی بتاؤ۔"

"اصفہانی چائے میں—"

اور سب پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا۔

"کیوں جناب اصفہانی چائے میں بڑے بڑے اسمارٹ لوگ دیکھنے میں آتے ہیں۔"

"اچھا بھئی قصہ مختصر یہ کہ پڑھتا ہے۔ فزکس میں ریسرچ کر رہا ہے گویا۔"

"پڑھتا ہے تو آفیسرز شاپ میں کہاں سے پہنچ گیا!"

"بھئی ہم نے فیصلہ کر دیا ہے آخر۔ ہوائی جہاز میں سول ایوی ایشن آفیسر ہے۔"

"یہ آئیڈیا کچھ—"

"تمھیں کوئی آئیڈیا ہی پسند نہیں آیا۔ اب تمھارے لیے کوئی آسمان سے تو خاص طور پر بن کر آئے گا نہیں آدمی۔"

"اچھا تو پھر یہی مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور جو غرور کے مارے اب تک ڈیڈی پر کال کرنے نہیں آئے۔"

—اور اس طرح انھوں نے ایک تخیلی کردار کی تخلیق کی تھی۔ سب ہی اپنے دلوں میں چپکے چپکے ایسے کرداروں کی تخلیق کر لیتے ہیں جو ان کی دنیا میں آکر بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ یہ بے چارے بے وقوف لوگ!!

لیکن پرکاش کا خیال تھا کہ ان کی Mad-hatter's پارٹی میں سب کے سب حد سے زیادہ عقل مند ہیں۔ مغرور اور خود پسند نشاط زریں جو ایسے Fantastic افسانے لکھتی ہے جن کا سر پیر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جن کی تعریف ایٹی کیٹ کے اصولوں کے مطابق سب کر دیتے ہیں جو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ کر بچوں کی طرح رو پڑتی ہے یا خوش ہو جاتی ہے اور پھر اپنے آپ کو سپر انٹلکچوئل سمجھتی ہے۔ رفعت، جس کے لیے زندگی ہمیشہ ہنستی ناچتی رہتی ہے اور افروز جو نہایت سنجیدگی سے نوفلسٹ کے فلسفے پر تھیسس لکھنے والی ہے کیوں کہ ان کی پارٹی کے دس احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انسان کو خود پسند، خود غرض اور مغرور ہونا چاہیے کیوں کہ خود پسندی دماغی صحت مندی کی سب سے پہلی علامت ہے۔

ایک سہ پہر وہ سب اپنے امریکن کالج کے طویل دریچوں والے فرانسیسی وضع کے میوزک روم میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ پیانو کے گرد جمع ہو کر سالانہ کونسرٹ کے اوپیرا کے لیے ریہرسل کر رہی تھیں۔ موسیقی کی ایک کتاب کے ورق الٹتے ہوئے کسی جرمن نغمہ نواز کی تصویر دیکھ کر پرکاش نے بے حد ہمدردی سے کہا: "ہمارے اوینائش بھائی بھی تو اسکارف، لمبے لمبے بالوں، خواب ناک آنکھوں اور پائپ کے دھوئیں سے ایسا بوہیمین انداز بناتے ہیں کہ سب ان کو خواہ مخواہ جینیس سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔" "آدمی کبھی جینیس ہو ہی نہیں سکتا۔" نشاط اپنے فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "اب تک جتنے جینیس پیدا ہوئے ہیں سارے کے سارے بالکل Girlish تھے اور ان میں عورت کا عنصر قطعی طور پر زیادہ موجود تھا۔ بائرن، شیلے، کیٹس، شوپاں— خود آپ کا نپولین اعظم لڑکیوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔" رفعت آرٹش دریچے کے قریب زور زور سے الاپنے لگی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ مرمریں ایوانوں میں رہتی ہوں، گانے کی مشق کر رہی تھی۔ باہر برآمدے کے یونانی ستونوں اور باغ پر دھوپ ڈھلنا شروع ہو گئی۔ "سپرب، میری بچیو! ہماری ریہرسلیں بہت اچھی طرح پروگرس کر رہی ہیں۔" اور موسیقی کی فرانسیسی پروفیسر اپنی مطمئن اور شیریں مسکراہٹ کے ساتھ میوزک روم سے باہر جا کر برآمدے کے ستونوں کے طویل سایوں میں کھو گئیں۔ نشاط نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ پیانو بند کر دیا۔ زندگی کتنی دل چسپ ہے، کتنی شیریں۔ دریچے کے باہر سائے بڑھ رہے تھے۔ فضا میں "لابوہیم" کے نغموں کی گونج اب تک رقصاں تھی۔ چاروں طرف کالج کی شان دار اور وسیع عمارتوں کی قطاریں شام کے دھندلکے میں چھپتی جا رہی

تھیں۔ میرا پیارا کالج، ایشیا کا بہترین کالج، ایشیا میں امریکہ! لیکن اس کا اسے اس وقت خیال نہیں آیا۔ اس وقت اسے ہر بات عجیب معلوم نہیں ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی ہم کتنے اچھے ہیں۔ ہماری دنیا کس قدر مکمل اور خوش گوار ہے۔ اپنی معصوم مسرتیں اور تفریحیں، اپنے رفیق اور ساتھی، اپنے آئیڈیل اور نظریے اور اسی خوب صورت دنیا کا عکس وہ اپنے افسانوں میں دکھانا چاہتی ہے تو اس کی تحریروں کو Fantastic اور مصنوعی کہا جاتا ہے — بے چاری میں!! موسیقی کے اوراق سمیٹتے ہوئے اسے اپنے آپ سے ہمدردی کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس نے ایک بار اوبناش کو سمجھایا تھا کہ ہماری شریعت کے دس احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمیشہ اپنی تعریف آپ کرو۔ تعریف کے معاملے میں کبھی دوسروں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ محفوظ ترین بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً خود کو یاد دلاتے رہا جائے کہ ہم کس قدر بہترین ہیں۔ ہم کو اپنے علاوہ دنیا کی کوئی اور چیز بھی پسند نہیں آسکی کیونکہ خود بادلوں کے محلوں میں محفوظ ہو کر دوسروں پر ہنستے رہنا بے حد دل چسپ مشغلہ ہے۔ زندگی ہم پر ہنستی ہے، ہم زندگی پر ہنستے ہیں۔ ''اور پھر زندگی اپنے آپ پر ہنستی ہے۔'' بے چارے اوبناش نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا اور اگر افروز کا خیال تھا کہ وہ اس دنیا سے بالکل مطمئن نہیں تو پرکاش اور نشاط زریں کو، جو دونوں بے حد عقل مند تھیں، قطعی طور پر یقین تھا کہ یہ بھی ان کی Mad-hatter's پارٹی کی cynicism کا ایک خوب صورت اور فائدہ مند پوز ہے۔

—اور سچ مچ افروز کو اس صبح محسوس ہوا کہ وہ بھی اپنی اس دنیا، اپنی اس زندگی سے انتہائی مطمئن اور خوش ہے۔ اس نے اپنی چاروں طرف دیکھا۔ اس کے کمرے کے مشرقی دریچے میں سے صبح کے روشن اور جھلملاتے ہوئے آفتاب کی کرنیں چھن چھن کر اندر آرہی تھیں اور کمرے کی ہلکی گلابی دیواریں اس نارنجی روشنی میں جگمگا اٹھی تھیں۔ باہر دریچے پر چھائی ہوئی بیل کے سرخ پھولوں کی بوجھ سے جھکی ہوئی لمبی لمبی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہل ہل کر دریچے کے شیشوں پر اپنے سائے کی آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھیں۔ اس نے کتاب بند کر کے قریب کے صوفے پر پھینک دی اور ایک طویل انگڑائی لے کر مسہری سے کود کر نیچے اتر آئی۔ اس نے وقت دیکھا۔ صبح جاگنے کے بعد وہ بہت دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ اس نے غسل خانے میں گھس کر کالج میں اسٹیج ہونے والے اوپیرا کا ایک گیت گاتے ہوئے منہ دھویا اور تیار ہو کر میز پر سے کتابیں اٹھاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کلاس کا وقت بہت قریب تھا۔ اس نے برساتی سے نکل کر ذرا تیزی سے لائن کو پار کیا اور پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ باغ کے راستے پر، سبزے کے کنارے، اس کا فیڈو روز کی طرح دنیا جہاں سے قطعی بے نیاز اور صلح کل انداز میں آنکھیں نیم وا کیے دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ اس کے لمبے لمبے سفید ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے محسوس کیا، اس نے دیکھا کہ دنیا کتنی روشن، کتنی خوب صورت ہے۔ باغ کے پھول، درخت، پتیاں، شاخیں اسی سنہری دھوپ میں نہا رہی تھیں۔ ہر چیز تازہ دم اور بشاش تھی۔ کھلی نیلگوں فضاؤں میں سکون اور مسرت کے خاموش راگ چھڑے ہوئے تھے۔ کائنات کس قدر پرسکون اور اپنے وجود سے کتنی مطمئن تھی۔ دور کوٹھی کے احاطے کے پچھلے حصے میں دھوبی نے باغ کے حوض پر کپڑے پٹخنے شروع کر دیے تھے اور نوکروں کے بچے اور بیویاں اپنے کوارٹروں کے سامنے گھاس پر دھوپ میں اپنے کاموں میں مصروف ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے شور مچا رہی تھیں۔ روزمرہ کی یہ مانوس آوازیں، یہ محبوب اور عزیز فضائیں — یہ اس کی دنیا تھی، اس کی خوب صورت اور مختصر سی دنیا اور اس نے سوچا کہ واقعی یہ اس کی حماقت ہے اگر وہ اپنی اس آرام دہ اور پرسکون کائنات سے آگے نکلنا اور سایوں کی اندھیری وادی میں جھانکنا چاہتی ہے۔ ایسے Adventure ہمیشہ بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے فیڈو کو پیار کر کے اس کی جگہ پر بٹھا دیا اور آگے بڑھ گئی۔ باغ کے احاطے کی دوسری طرف انگریز ہمسائے کا بچہ گلِ داؤدی کی کیاریوں کے کنارے کنارے اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار دھوپ میں جھلملاتے پروں والی تیتریوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے خوب زور زور سے گا رہا تھا۔ "Ah! this bootiful, bootiful world!" اس نے سوچا: ننھے مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور، خوب گاؤ! اور اپنے لکڑی کے گھوڑے پر خیالی مہمیں سر کرتے رہو۔ ایک وقت آئے گا جب تمھیں پتا چلے گا کہ دنیا کتنی بوٹی فل نہیں ہے۔

اور امرودوں کے جھنڈ کے اس پار کالج کے میوزک روم میں تیزی سے ریکارڈ بجنے شروع ہو گئے اور اسے یاد آگیا کہ کالج سے واپسی پر اسے اوپیرا کے علاوہ بنگال ریلیف کے ورائٹی شو کی ریہرسل کے لیے بھی جانا ہے اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ شام کو پروگرام تھا اور چاروں طرف زور شور سے اس کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ بنگال کا قحط ان دنوں اپنی انتہا پر پہنچا ہوا تھا اور ہر لڑکی اور لڑکے کے دل میں کچھ نہ کچھ کرنے کا سچا جوش موجزن تھا۔

ٹکٹ فروخت کرنے کے لیے سائیکلوں پر سول لائنز کی کوٹھیوں کے چکر لگائے جا رہے تھے۔ مشاعرے کے انتظام کے سلسلے میں بار بار ریڈیو اسٹیشن پر فون کیا جا رہا تھا کیوں کہ اسی ہفتے ریڈیو پر مشاعرہ ہوا تھا جس کی شرکت کے لیے بہت سے مشہور ترنم سے پڑھنے والے شعرائے کرام تشریف لے آئے تھے۔ میوزک روم کے پیچھے کے اور چرڈ میں بہت سی لڑکیاں ایک درخت کے نیچے انتہائی انہماک سے مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ کچھ پروگرام کے خوب صورت کاغذوں پر پینٹنگ کر رہی تھیں، کچھ قہقہے لگا لگا کر اس افتتاحیہ نظم کی تک

بندی کررہی تھیں جو پروگرام شروع ہونے پر قوالوں کے انداز اور انھی کے بھیس میں گائی جانی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی ان میں شامل ہوگئی۔ ''اور ہمارے سپر جینیس گروپ کے باقی افراد کہاں رہ گئے؟'' سعیدہ نے پوچھا۔

''پرکاش تو آج کل مہرہ اور اویناش کے ساتھ ہندوستان آزاد کرانے میں سخت مصروف ہے اور رفعت دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے کے بعد محبت میں مبتلا ہوگئی ہے۔''

''ہائے چاری—اور ہمارا زبردست ادیب، مصور اور افسانہ نگار ابھی تک نہیں پہنچا۔''

''آ گئے ہم—'' نشاط نے درخت کے نیچے پہنچ کر اپنی جاپانی چھتری بند کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر ادا کر بھائی، جس نے ایسا ادیب بنائی۔'' جلیس ایک قلابازی کھا کر بولی، ''چلو اب قوالی مکمل کریں۔'' اور ہنس ہنس کر لوٹتے ہوئے قوالی تیار کی جانے لگی۔ کیسے بے تکے اور دل چسپ شعر تھے: ''وہ خود ہی نشانہ بنتے ہیں، ہم تیر چلانا کیا جانیں—

انورسٹی کے پڑھنے والے ہم گانا بجانا کیا جانیں۔'' اور جانے کیا کیا۔

کتنی خوش تھیں وہ سب— زندگی کی یہ معصوم، شریر، چھوٹی چھوٹی مسرتیں!!

اور اس وقت بھی دنیا اتنی ہی خوب صورت اور روشن تھی جب کہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی ترچھی ترچھی نارنجی کرنیں اس کے دریچے میں سے گزرتی ہوئی گلابی دیواروں پر ناچ رہی تھیں اور کتابوں کی الماریوں اور سنگھار میز کی صفائی کرنے کے بعد صوفے کو دریچے کے قریب کھینچ کر شال میں لپٹی ہوئی کلاس کے نوٹس پڑھنے میں مصروف تھی۔ باہر فضا پر ایک آرام دہ، لطیف اور پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے دقفے کے بعد دور مال پر سے گزرتی ہوئی کاروں کے طویل ہارن سنائی دے جاتے تھے۔ دوسرے کمرے میں رفعت آہستہ آہستہ کچھ گا رہی تھی اور مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور کے برآمدے میں مدھم سروں میں گٹار بج رہا تھا۔

اس نے کشن پر سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ فرصت، اطمینان اور سکون کے یہ لمحات۔ کیا آپ کو ان لمحوں کی قدر نہیں جو ایک دفعہ افق کی پہاڑیوں کے اس پار اڑ کر چلے جائیں تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ وہ لمحے جب جاڑوں کی راتوں میں ڈرائنگ روم کے آتش دان کے سامنے بیٹھ کر کشمش اور چلغوزے کھاتے ہوئے گپ شپ اور scandal mongering کی جاتی ہے۔ وہ لمحے جب دھوپ میں کاہلی کے احساس کے ساتھ سبزے پر بلیوں کی طرح لوٹ لگا کر ریکارڈ بجائے جاتے ہیں اور لڑا جاتا ہے اور پھر ایسے میں اسی طرح کے بیتے ہوئے وقتوں کی یاد اور یہ احساس کہ اپنی حماقت کی وجہ سے وہ وقت اب واپس نہیں آسکتا، کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔

دریچے کے نیچے روش پر موٹر بائیک رکنے کی آواز آئی۔ اس نے کشن پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ شاید مہرہ آیا تھا۔ رفعت دوڑتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اتر کے باغ میں چلی گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور اس کے دریچے کے سامنے روش پر سے وہ سب گزرنے لگے۔ وہ بے چارے فریب خوردہ انسان جنھیں زندگی نے رنجیدہ کیا، زندگی جن کی وجہ سے غمگین ہوئی لیکن پھر بھی وہ سب وہاں موجود تھے۔ اس کے خیالوں میں آنے پر مصر تھے۔ اسے شاید یاد آیا—اور اس کے سارے بھائی۔ دور دراز کی یونیورسٹیوں اور میڈیکل کالجوں میں پڑھنے والے یہ شریر، خوب صورت اور ضدی، افسانوی سے رشتے کے بھائی، جو چھٹیوں میں گھر آتے ہیں اور ان کے رشتے کی بہن یا ان کی بہنوں کی سہیلیاں ان کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ وہ ان سے لڑتے ہیں، راتوں کو باغ میں چاند کو دیکھا جاتا ہے، پھر وہ ان سب کو دل شکستہ چھوڑ کر یا محاذ جنگ پر چلے جاتے ہیں یا ان میں سے کسی ایک سے شادی ہوجاتی ہے— اُف یہ حماقتیں—!!

اور اسے وہ باتیں یاد کر کے ان سب پر بے اختیار ترس سا آ گیا۔ یہ فریب کاریاں، یہ بے وقوفیاں!!

اور اسے یاد آیا— فرصت اور بے فکری کے ایسے ہی لمحوں میں ایک مرتبہ اپنے اپنے مستقبل کی تصویریں کھینچی گئی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ سارے بہن بھائی ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ دن بھر تصویریں اتاری جاتی تھیں۔ بزرگوں سے نظر بچا کر پینٹری میں سے حلوہ اور آئس کریم اڑائی جاتی تھی۔ بے تکی شاعری ہوتی تھی۔ اس نے کہا تھا: ''اب بھئی اسلم کا حشر سنیے۔ جب آپ پاس کر کے نکلیں گے تو ہوجائیں گے ایک دم سے لفٹیننٹ، پھر کیپٹن، پھر میجر۔ ڈاکٹروں کو بڑی جلدی جلدی ترقی دی جاتی ہے۔ بس— اور جناب اس قدر خوش کہ دنیا کی ساری لڑکیاں آپ پر فِدا ہیں۔ ہال میں جا رہے ہیں، پکچرز میں لڑکیاں اچک اچک کر آپ کی زیارت کررہی ہیں، چاروں طرف برف کی سفید سفید گڑیوں جیسی، انگارہ سے سرخ ہونٹوں والی نرسیں بھاگی پھر رہی ہیں۔ چھٹی پر گھر آتے ہیں تو سب کا استقبال ہوا جارہا ہے اور آپ مارے شان کے کسی کو لفٹ ہی نہیں دیتے۔ سٹیس یا مل کے ہاں بہترین پوز کی بہت سی تصویریں کھنچوالی ہیں اور وہ اپنی ایڈمائرز کو عنایت کی جارہی ہیں۔ پھر بھائی لڑائی کے بعد جو آپ کو کان پکڑ کر نکال کے باہر کھڑا کردیا جائے گا کہ بھیا گھر کا راستہ لو تو جناب آپ امین آباد کے پیچھے ایک پھٹیچر سا میڈیکل ہال کھول کر بیٹھیں گے۔ اب بھائی اسلم بھائی ہیں کہ ایک بدرنگ سی کرسی پر بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں۔

کوئی مریض آکے ہی نہیں دیتا۔ پھر بھی ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوگا کہ ایک شان دار بیوک رکے گی آپ کی دکان کے آگے اور اس میں سے ایک بے حد عظیم الشان خاتون ناک پر رومال رکھے اتر کر پوچھیں گی کہ بھئی ہمارے فیڈو کو زکام ہوگیا ہے۔ یہاں کوئی گھوڑا اسپتال کا ڈاکٹر—''

اور اسلم نے کہا تھا: ''ہش، چپ رہو جی— بیگم صاحبہ ہو کس خیال میں۔ بندہ تو ہوجائے گا لفٹنٹ کرنل تین سال بعد۔ اور لڑائی کے بعد ہوتا ہے سول سرجن۔ اور بھئی کیا ہوگا کہ ایک روز بی افروز اپنے پندرہ بچوں کی پلٹن لیے بیل گاڑی میں چلی آرہی ہیں اور سامنے گاڑی بان کے پاس یہ بڑا سا زرد پگڑ باندھے اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے بی افروز کے راجہ بہادر بیٹھے ہیں اور بھئی ہم چپراسی سے کہلوادیں گے کہ سول سرجن صاحب معائنہ کرنے تشریف لے گئے ہیں، شام کو آئیے گا۔ اب جناب افروز بیگم برآمدے میں بینچ پر بیٹھی ہیں برقعہ پہنے—''

''ہائے چپ رہو بھئی— خدا نہ کرے جو زرد پگڑ اور بیل گاڑی—!''

''اور کیا، منظر احمد سے جو تم شادی کروگی تو کیا رولز رائس چلا کرے گی تمھارے یہاں؟ بیل گاڑیوں پر ہی پڑی جایا کرنا اپنے گاؤں۔''

''بیل گاڑی پر جانا تم اور زرد پگڑ بھی خدا کرے تم ہی باندھو۔ آئے وہاں سے بڑے بے چارے۔''

''اور بھئی حضرت داغ کا یہ ہوگا— شاہد نے اپنے مخصوص انداز سے کہنا شروع کیا'' کہ یہ خاکسار جب کئی سال تک ایم.ایس.سی. میں لڑھک چکے گا تو وار ٹیکنیشنز میں بھرتی ہوجائے گا اور پھر بھی رفعت کی کوٹھی پر پہنچے گا کہ بھئی بڑے دن کے سلام کے لیے آئے ہیں۔ صاحب کہلوا دیں گے کہ پھر آنا، صاحب کلب گئے ہیں۔ بس بھئی ہم وہاں برساتی کی سیڑھیوں پر، گملوں کی آڑ میں، اس امید پر بیٹھ جائیں گے کہ شاید بی رفعت نکل آئیں اندر سے لیکن جب چپراسی کی ڈانٹ پڑے گی تو چلے آئیں گے واپس اور کوٹھی کے پھاٹک کے باہر پہنچ کر کان میں سے چونی نکال سگریٹ اور دو پیسوں والی سینما کے گانے کی کتاب خرید کر گاتے ہوئے گھر کا راستہ لیں گے— اکھیاں ملا کے— جیا برما کے— چلے نہیں جانا۔''

''نہیں بھئی، خدا نہ کرے، ایسا کیوں ہو! تم تو پروگرام کے مطابق اعلیٰ درجے کے فلرٹ بنوگے اور ریلوے کے اعلیٰ انجینئر۔ اپنے ٹھاٹ سے سیلون میں سیر کرتے پھرا کروگے۔'' رفعت نے کہا تھا۔

باغ میں سے رفعت کے مدھم قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جو کچھ انھوں نے مذاق مذاق میں سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ وہ کبھی بھی نہیں ہوتا اور اسلم اور اس کی کھینچی ہوئی راجہ بہادر کی تصویر اس کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔

اسلم، جو میدان جنگ میں جا کر عرصہ ہوا لاپتہ ہو چکا تھا اور منظر احمد، جو اس شام آرٹس اینڈ کرافٹس ایمپوریم کے بڑے بڑے شیشوں والی جھلملاتی ہوئی گیلری میں سے نکل کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا لیکن جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ہمیں اپنے خیالوں سے بھی یوں ہی نکال دو تو جانیں۔

اور باغ میں اندھیرا چھانے لگا۔ گٹار بجتا رہا اور افروز سوچتی رہی: زندگی کے یہ مذاق! اس روز ''یوم ٹیگور'' کے لیے ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹرا کے ساتھ رقص کی ری ہرسل کرنے کے بعد وہ پرکاش اور اجلا کے ساتھ وہاں واپس آرہی تھی اور لیلا رام کے سامنے سے وہ اپنی اسپورٹس کار پر آتا نظر آیا تھا— پرکاش کو دیکھ کر اس نے کار روک لی تھی: ''کہیے مس شیرالے کیا ہورہا ہے؟'' ''گھر جارہی ہیں۔'' ''چلیے میں آپ کو پہنچا دوں۔''

اور افروز نے کہنا چاہا تھا کہ ہماری کار آتی ہوگی، آپ تکلیف نہ کیجیے۔ لیکن پرکاش نے اپنی مثالی خوش خلقی کی وجہ سے فوراً اس کی درخواست قبول کرلی تھی اور پھر اس کے گھر تک وہ کار پندرہ میل کی رفتار سے اس قدر آہستہ ڈرائیو کرکے لایا تھا جیسے کسی بارات کے ساتھ جارہا ہو، محض اس لیے کہ اسے افروز کو اپنی کار میں زیادہ سے زیادہ دیر تک بٹھانے اور اس سے باتیں کرنے کا موقع مل سکے اور اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ اس منظر احمد کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتی تو بہر حال مائنڈ بھی نہیں کرے گی، حالاں کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اعلیٰ قسم کا فلرٹ ہے، کبھی کبھی ڈرنک بھی کرلیتا ہے اور نشاط نے تو یہ تک کہا تھا کہ اپنی ریاست میں اس کی کیپ بھی موجود ہے۔'' لیکن بھئی کیا تعجب ہے؟'' نشاط کہہ رہی تھی، ''سب ہی جانتے ہیں کہ تعلقہ داروں کے لڑکے کیسے ہوتے ہیں۔''

اور پھر ایک روز وہ اور پرکاش خریداری کے بعد کافی ہاؤس چلے گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ برسات کی دوپہر! بارش ہوکر رکی تھی۔ فضا پر ایک لطیف سی خنکی چھائی ہوئی تھی۔ کافی ہاؤس میں بھی قریب قریب بالکل سناٹا تھا۔ وہ ایک ستون کی آڑ میں بیٹھ گئے اور سامنے کے مرمریں ستون پر لگے ہوئے بڑے آئینے میں انھوں نے دیکھا کہ دوسری طرف منظر احمد بیٹھا ہے۔ خوب! یہ حضرت دوپہر کو بھی کافی ہاؤس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس نے ذرا نفرت محسوس کرنے کی کوشش کی اور پرکاش کو دیکھ کر وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہوا ان کی میز پر آبیٹھا۔ ''ہلو— افروز سلطانہ— ہلو—'' اس نے اپنے لہجے میں بقدر ضرورت خنکی اور خشکی پیدا کرتے ہوئے مختصر سا جواب دے دیا اور کافی بنانے میں مشغول ہوگئی۔ وہ اپنی تخیلی سی آنکھوں سے باہر کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ کتنا بنتا ہے۔ یہ شخص بھی کبھی سنجیدہ ہوسکتا ہے، جس کی زندگی کا واحد مقصد کھیلنا اور صرف کھیلتے رہنا ہے؟

پرکاش خریداری کی فہرست بنانے میں منہمک تھا۔ پھر وہ یک لخت کہنے لگا: ''افروز سلطانہ! آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دل میں میری طرف سے بڑی خوف ناک قسم کی بدگمانیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔''

''جی مجھے بدگمانی وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں۔ بدگمانیاں تو اسے ہو سکتی ہیں جسے پہلے سے آپ کی طرف سے حسنِ ظن ہو۔ یہاں آپ سے دل چسپی ہی کس کو ہے؟''

''ہنہ— ذرا بنا تو دیکھو۔'' وہ کہتا رہا: میں نے سنا ہے کہ آپ کو بتایا گیا ہے میں— میں ڈرنک کرتا ہوں—اور— اور اسی قسم کی بہت سی حرکتیں— مختصر یہ کہ میں انتہائی برا آدمی ہوں— کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ باتیں صحیح ہو سکتی ہیں؟ کیا آپ مجھے واقعی ایسا ہی سمجھتی ہیں؟'' اور اس نے آہستہ آہستہ بڑی رومیٹک نقرئی آواز میں بات ختم کر کے سگریٹ کی راکھ جھٹکی اور پام کے پتوں کے پرے دیکھنے لگا— اور وہ سچ مچ بہت پریشان ہو گئی کہ کیا کہے کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ منظر احمد اس وقت بقول شخصے قطعی نون سیریس نہیں ہے اور اس نے کہا: ''بھئی میں نے قطعی کوئی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کے متعلق—''

''اچھا، یہ بات ہے۔'' اس نے بات ختم کرنے کا انتظار کیے بغیر اسی نقرئی آواز میں آہستہ سے کہا، ''اجازت دیجیے، خدا حافظ مس شیرالے—'' اور وہ ایک دم سے اس کی میز پر سے اٹھ کر چلا گیا اور کرلی لوکس کشنوں کے انبار پر سے گر پڑی۔ ''جناب تشریف لے گئے۔'' پرکاش نے فہرست کے کاغذ پر سے سر اٹھا کر پوچھا۔ باہر اگست کی ہوائیں ہال کے بڑے بڑے دریچوں کے شیشوں سے ٹکراتی رہیں۔

رات کی تاریکی باغ پر پھیل گئی۔ مہرہ کی گڑگڑاتی ہوئی موٹر بائیک روش پر سے گزر کر باہر ہال کے طویل اندھیرے میں کھو چکی تھی۔ نشاط اور رفعت باتیں کرتی اور گنگناتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔

''جناب! بہترین اوپیرا رہے گا۔'' رفعت کہہ رہی تھی۔

''اور ہمارا تازہ افسانہ جو اس قدر سپرب تھا۔ اب ہماری کتاب کا ریڈیو پر بقول شخصے بڑا شاندار ریویو کیا جائے گا۔'' نشاط صوفے پر کودتے ہوئے بولی۔

''من ترا سپر جینیس بگویم— تم مہرہ کے انگریزی رسالے میں اپنے اوپیرا کی بہت سی تعریف کر دینا۔'' رفعت نے کہا۔

''ہاں یہ تو کریں گے ہی۔'' نشاط جیسے یہ پہلے طے کر چکی تھی۔

''بھئی ریڈیو اسٹیشن پر آج کل سب ایک سے ایک واش آؤٹ نظر آتے ہیں، کیا کیا جائے۔'' رفعت اکتا کر بولی۔

''اور شاہد بے چارہ زخمی ہو گیا۔'' نشاط نے اور بھی زیادہ اکتا کر کہا۔

''ممی کہہ رہی تھیں کہ محاذ پر گیس سے اس کی آنکھیں خراب ہو گئیں۔''

''ہاں— سچ مچ— کافی خوب صورت آنکھیں تھیں اس بے چارے کی۔''

اور تھوڑی دیر بعد اوپیرا کے اطالوی رقص کی مشق کے لیے پرکاش اور اس کے ساتھ بہت سی لڑکیاں آگئیں اور وہ سب ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

افروز کے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ دور، زندگی کی Fantasy پر، دھندلی دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

پھر شوپاں کی موسیقی فضا میں لہرا اٹھی۔ اس رات اوپیرا شروع ہو چکا تھا اور تاریکی کے پروں پر تیزی سے اڑتی ہوئی ساعتوں کے ساتھ ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ رقص گاہ کے جگمگاتے دریچوں پر پردے گرائے جا رہے تھے۔ یوکلپٹس کی اونچی اونچی شاخوں سے بھیگتی رات کا تنہا اور خنک چاند ہال کے پچھلے دریچے میں سے اندر جھانک کر اوپیرا کا آخری نغمہ سننے کی کوشش کر رہا تھا، پیانو کے گہرے بھاری سروں کا نغمہ، جس کی لہریں جھلملاتے ہوئے عنابی مخملیں پردوں کے پیچھے ڈوبتی جا رہی تھیں۔

اور فٹ لائٹ کی تیز سفید کرنوں سے جگمگاتی اسٹیج پر نقرئی شیفون میں ملبوس سیاہ آنکھوں والی لڑکیوں کی ایک قطار ہاتھوں میں سنہری اور سیاہ پنکھیاں لیے ہوئے آئی اور دوسری طرف سے اطالوی نوجوانوں کا ایک پرا داخل ہوا جن کی ٹوپیوں میں لمبے لمبے خوب صورت پر شاہانہ انداز سے سجے ہوئے تھے اور جن کی روپہلی تلواریں اسٹیج کی روشنی میں جھلملا رہی تھیں۔ انھوں نے دوزانو جھک کر سینوریتاؤں سے رقص کی درخواست کی۔ سرخ گلابوں کے گچھے پھینکے گئے اور آرکیسٹرا کی ایک گونج دار دھمک کے ساتھ آخری رقص شروع ہو گیا۔ پھر تیزی سے گھومتے ہوئے رنگین سایوں، چکر کاٹتے ہوئے پروں اور تیز گرم موسیقی کے اس پرشور بھنور کی لہریں آہستہ آہستہ پھیلتی گئیں اور رقص کی رفتار دھیمی ہو کر پردے کے پیچھے سے بلند ہونے والے آخری سروں کی گونج میں ڈوب گئی۔

ہال روشنیوں سے جاگ اٹھا اور سرخ کشنوں پر بیٹھے، دبی دبی جمائیاں لیتے ہوئے تماشائی جیسے ایک طویل خواب سے چونک کر ایک بار پھر اپنی دنیا میں واپس آگئے اور بھاری بھاری قدموں غبار آلود آنکھوں کے ساتھ ہال سے نکل کر کلوک روم، گیلریوں اور پورچ کی سیڑھیوں پر اپنے اپنے دوستوں کے گروہوں میں شامل ہو کر موسیقی کی تنقید اور ادھر ادھر کی بے معنی، بے کار باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''سیزن کا بہترامیچر پرفورمینس رہا۔''

''جینٹ سسٹرز بالکل فلاپ ہو گئیں اس مرتبہ۔'' آج پتا چلا کہ نشاط اور رفعت کتنی Talented لڑکیاں ہیں۔''

''مسوری میں پچھلے سال میں نے مارگیریٹ جورڈن کو یہی پارٹ کرتے دیکھا، کیا سپرب چیز تھی۔'' پھر دوستوں کے گروپ منتشر ہونے شروع ہوئے۔ خواتین کلوک روم سے اوورکوٹ لیے، میک اپ ٹھیک کرتی ہوئی نکلیں اور شب بخیر اور خدا حافظ کی مدھم آوازوں کے ساتھ کاریں اسٹارٹ کی جانے لگیں۔

اور اس وقت انور نے افروز کو دیکھا جو رفعت، نشاط اور پرکاش کے ساتھ گرین روم سے نکل کر بے حد تکلف سے اپنا اوورکوٹ سنبھالے اپنے بھائیوں کے ساتھ مشغولیت سے باتیں کرتی پورچ کی مرمریں سیڑھیوں سے اتر کر لمبی لمبی چمکیلی کاروں کی طویل فلیٹ کی طرف اپنی مورس میں بیٹھنے کے لیے جارہی تھی۔ ''افوہ! رفی دیکھنا، چاند کتنا اسمارٹ لگ رہا ہے۔'' لڑکیوں میں سے ایک نے چلتے چلتے کہا اور سب آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ چاند یوکلپٹس کی ٹہنیوں میں سے نکل کر آسمان کی شفاف سطح پر تیر رہا تھا۔ ''خدا تم لڑکیوں سے ہر ذی ہوش جاندار کو محفوظ رکھے۔'' یہ نشاط کے بھائیوں میں سے ایک کی آواز تھی اور پھر نشاط اسے پورچ کے ایک اونچے یونانی ستون کے پیچھے کھڑا دیکھ کر چپکے سے بولی: ''جناب بھی تشریف لائے تھے۔''

''جی ہاں اور شاہد صاحب بھی۔'' رفعت نے کہا اور پھر ان کی کار زناٹے کے ساتھ سامنے سے نکل گئی اور لا مارٹیز کے لڑکوں کی ایک ٹولی نے رقص گاہ سے نکل کر سڑک پر جاتے ہوئے ''جپسی مون'' اونچے سروں میں شروع کردیا تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی کار کی طرف بڑھا جو موٹروں کی شان دار فلیٹ کے آخری سرے پر درختوں کے اندھیرے میں کھڑی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا: ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ تم سوچتے ہو گیتوں کی سرزمین میں رہنے والی وہ لڑکی جس کے بالوں میں سرخ گلاب سجے ہوئے ہیں کبھی نہ کبھی تو تمھارے خوابوں کے دریچے کے نیچے سے گزرے گی اور تم اسے اپنا گٹار کا نغمہ سنا سکو گے اور سرخ گلابوں میں رہنے والی لڑکی کہتی ہے کہ ایک روز وہ موسم گل کا شہزادہ اس کے خوابوں کے ایوانوں میں سے نکل کر آئے گا اور بس پھر سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن ٹریجڈی دیکھیے وہ دونوں اس پگڈنڈی پر چل جاتے ہیں جو پریوں کی سرزمین کو جاتی ہے لیکن ایک دوسرے کو دیکھے بغیر بے پروائی اور بے نیازی سے گزر جاتے ہیں اور اوپیرا ختم ہوجاتا ہے اور تماشائی اپنے اپنے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر رومالوں اور دستی پنکھیوں کی اوٹ میں سے اپنے ساتھیوں سے کہتے ہیں: ''کیوں — کیسی رہی؟''

اور شاہد نے آگے بڑھ کر کہنا چاہا — کتنے جھوٹے ہو بھائی۔ تم سب شروع سے آخر تک ایک طویل مغالطے ایک خوب صورت، دل چسپ فریب میں مبتلا رہنے کے اس قدر شوقین کیوں ہو؟ تمھارا ''لا بوہیم'' کا اوپیرا، ''جپسی مون'' کے نغمے اور شوپان کی موسیقی۔ تمھارے تکوتما کے تصورات، رفائیل اور لیونارڈو کی تصویریں اور براؤننگ کی نظمیں۔ تمھاری بد دماغ افروز سلطانہ اور تمھاری سپر انٹلکچوئل اور مغرور افسانہ نگار نشاط، منظر احمد اور اس کی اسپورٹس کار، پرکاش اور اس کی Mad-hatter's اوبناش اور اس کی فیشن ایبل Cynicism تم سب ان سب چیزوں، ان ساری باتوں سمیت آج کی رات میرے بھوکے رہنے کی وجہ ثابت نہیں کرسکتے۔ تم تو اس کا خیال بھی نہیں کرسکتے کہ تم جیسا انسان، جو تمھارے ساتھ اوپیرا میں آسکتا ہے اور جس کے شہر کے سارے کافی ہاؤس اور سارے فرانسیسی اور اطالوی ریسٹوران کھلے ہوئے ہیں، بغیر کچھ کھائے پیے بھی زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سلمنگ کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں تمھارے مسٹر شوپاں سے کہنا چاہتا ہوں: قبلہ! آپ کو اچھی طرح ڈنر اڑانے کے بعد ہی یہ آسمانی نغمے کمپوز کرنے کی سوجھتی ہوگی۔ آپ میری جگہ تشریف لے آیئے اور میں آپ کے پیانو پر پہنچ کر ایسے ایسے نغمے بنا سکتا ہوں جن کو سن کر دنیا آپ کے اور آپ کے سارے قبیلے والوں کے شاہکار، جو لوگوں کو اب تک احمق بناتے رہے ہیں، ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔ تمھارا جپسی مون کم از کم میری آنکھیں تو ٹھیک نہیں کرسکتا۔ تمھاری عطر بیز ہوائیں انڈین ریڈ کراس کی اس خوب صورت ویلفیئر آفیسر تک میرا کوئی پیغام نہیں پہنچا سکتیں جو اس وقت قاہرہ میں زخمیوں کے ساتھ ایسی ہی فریب آلود خوش گوار باتیں کرکے انھیں اسی حماقت میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگی۔ وہ ویلفیئر آفیسر جو بچوں کی طرح لکڑی کے رنگیں ٹکڑوں اور چمکیلی تصویروں کے ذریعے بہلا کر یہ بھلانے کی کوشش کرتی تھی کہ میری آنکھیں، جو خوب صورت کہلاتی تھیں، جرمنوں کی گیس نے خراب کردی ہیں اور مجھے ڈسچارج کردیا جائے اور مجھے کہیں نوکری نہ مل سکے گی۔ یقیناً تمھاری مونالیزا اور تمھارا روپہلا چاند —''

اور چاند چیڑ پر تیرتا ہوا اس کی بالکونی کے بالکل اوپر پہنچ گیا۔ وہ باہر نکل آئی اور ریلنگ پر جھک گئی۔ مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور کا ڈرائنگ روم خاموش پڑا تھا اور کہیں مدھم سروں میں گٹار بجایا جارہا تھا اور اس نے کہنا چاہا — مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور — تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ تم اور تمھارا سیاہ آنکھوں والا دوست — آدھی رات کے چاند کی طرح زرد اور غمگین — کیا تمھیں ہمسایوں کے اس چھوٹے بچے نے نہیں بتایا کہ دنیا کتنی بیوٹی فل ہے اور ایسی خوب صورت، شاداب اور بشاش دنیا میں غمگین رہنا جرم ہے اور مسرت کی صحت مندی کی توہین۔ کیا تم نے بھی تخیلی کردار بنائے ہیں؟ کیا تم کو بھی خواب دیکھنے آتے ہیں؟ جب روپہلا چاند سیب کے اور چیڑ پر جھلملاتا ہے اور فضاؤں میں موزارٹ کے نغمے رقصاں ہوتے ہیں اس وقت میں تم سے چپکے سے پوچھنا

چاہتی ہوں— کیا تم مجھے جانتے ہو؟ کیوں کہ میں تم کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں— جیسے ہم جنم جنم کے ایک دوسرے کے خاموش ساتھی ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے۔ کیا تم بھی تنہا ہو۔ اتنی بڑی دنیا اور دنیا والوں میں گھرے ہوئے— لیکن بالکل تنہا!

—اور نیچے پہلو کے باغ میں دو سائے آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ اور ان میں سے ایک سایہ چاند کے مقابل میں کھڑا ہو کر کہنے لگا: خدا کی قسم، میرے دوست، تم جانتے ہو کہ یہ سب غلط ہے۔ یہاں سب جھوٹے ہیں لیکن پھر بھی تم بے وقوف بنتے ہو۔ مجھ سے پوچھو، میں تمھیں بتاؤں گا کہ زندگی کیا چیز ہے۔ وہ سبز آنکھوں والی زرد رو جولیٹ، جو نواب کے ساتھ والز کرتی تھی اور جس نے ایک دفعہ میرے ساتھ بھی رقص کیا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں ہز ہائنس کا اے.ڈی.سی. بنا دیا جاؤں گا، وہ اب بھی کوک ٹیل پارٹیوں کے بعد ڈھولک کے ساتھ اسی طرح گاتی ہے: ''میں نہ بولی چڑیا کو کاگ لیے جائے۔'' سب سنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ تم نے اس لغویت، پر غور کیا ہے؟ چڑیاں اور کوے— چڑیاں اور کوے یا تتلیاں اور بھنورے— زندگی کا تعاقب— یہ دیوانگی— یہ جنون— مجھ سے میری بنتِ عم، خوب صورت اور شریر رفعت، نے کہا تھا: ''ہائے شاہد بھائی، تم کتنے گڈ وہو۔ تم جنگ سے واپس آجاؤ پھر بہت سارے پروگرام بنائیں گے۔'' اور میں نے، کتنا احمق تھا میں، ان الفاظ کے سہارے پر کتنے خواب دیکھے۔ رفعت میرے ساتھ ہوگی اور زندگی کا خوش گوار اور پھولوں سے گھرا ہوا راستہ میرے سامنے لیکن اس وقت میں یہاں، اس اندھیرے میں، اکیلا ٹہل رہا ہوں اور میرے ساتھ صرف رفعت کا ایک خط ہے جس میں اس نے لکھا ہے: ''ہائے شاہد بھائی، کتنا افسوس ہے تمھاری آنکھیں خراب ہوگئیں۔ خدا کرے جلد بالکل اچھے ہو جاؤ۔ شام کو ہمارے اوپیرا میں ضرور آنا۔'' اور بے وقوف مہرہ رومان کی اندھی پٹی ہوئی پگڈنڈیوں پر خوش خوش چل رہا ہے جن پر زرد چاند جھلملاتا ہے۔

اور زرد چاند درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے بھائی، لیکن اس حماقت میں مبتلا ہو جانے کا احساس ہی کتنا پُر لطف اور دل چسپ ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہنا چاہا، سائمن اسٹائلائٹیز کی طرح جو اونچا ستون تم نے اپنے لیے منتخب کیا ہے اس کی بلندی پر سے ایک لمحے کے لیے نیچے اتر آؤ اور ان خود رو خوشبودار پھولوں کی جھاڑیوں کے پاس میرے پاس گھاس پر بیٹھو اور ہم محبت کے وہ گزرتے ہوئے گیت سنیں جو وقت کی سنہری ریت کے اس پار پہنچ کر پھر کبھی واپس نہیں آتے۔ محبت کے وہ آسمانی، الوہی نغمے جو شاپاں، موزارٹ اور ہینڈل نے ایسے ہی وقت میں، ان ہی لمحوں کے لیے، تخلیق کیے تھے۔

اس روز سعیدہ کہہ رہی تھی: انور بھائی کتنا اچھا لگتا ہے کوئی ہم کو پسند کرے، ہم کسی کو پسند کریں۔ کوئی ہمیں چاہے۔ زندگی کے خالی، بے معنی اور بے رنگ نقوش میں اپنی چھوٹی چھوٹی شکستوں کے رنج، فتح مندیوں کے غرور اور ننھی منی مسرتوں کے اطمینان بخش احساسات سے دل کشی اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ یہ احمقانہ، طفلانہ خواہشیں— کوئی ہمیں چاہے!

— تم یہ کہتے ہو— تم جو سوسائٹی کی ساری 'ہائی لائٹس' کے پسندیدہ اور محبوب ہیرو ہو۔ نشاط جیسی مغرور لڑکی تمھارے ساتھ ناچتی ہے۔ جلیس تم کو روزانہ فون کرتی ہے۔ اُجلا، جو کبھی کسی کو گانا نہیں سناتی، ریڈیو پر محض اس لیے گاتی ہے کہ تم سنو اور چونکہ صرف ایک خود پسند لڑکی نے تمھارے سامنے جھکنے سے خاموشی سے انکار کر دیا ہے تو مرے جا رہے ہو، احمق!

ہم سب احمق ہیں! اس نے کہا اور گٹار کی آواز مدھم ہوتی گئی اور کنواری رات کا اندھیرا باغ پر جھک گیا۔

اور وہ بالکونی پر سے ہٹ کر اندر آگئی۔ وہ اپنے بلند ستون پر سے نہیں اتر سکتی تھی۔ نہیں اترنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی شکست کے اعتراف کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے سوچا اور وہ پریوں کی سرزمین کو جانے والی دو متوازی پگڈنڈیوں پر تھوڑی دور تک اسی طرح چلتے رہے اور پھر یہ پگڈنڈیاں ایک دوسرے کو پار کرتی ہوئی علاحدہ ہوگئیں۔

اور رفعت نے ایک روز خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا: افروز پیاری ایک ٹریجیڈی ہوگئی۔ تم نے تو نو لفٹ کر دیا اور اس بے چارے نے اپنی شکستہ دلی سے اکتا کر آخر شادی کی درخواست کر ہی دی اور اب میں تمھارے اور ممی کے ساتھ مسوری نہیں جا سکوں گی— ہم کشمیر جا رہے ہیں!

اور افروز کے خوابوں نے جس تخیلی کردار کو جنم دیا تھا وہ اسی کی حیثیت سے اس کی زندگی میں تھوڑے سے وقفے کے لیے آیا اور اسی طرح نکل گیا۔ افروز کے لیے وہ صرف Mr Boy Next-door تھا، چاند کی وادی کا باسی۔ لیکن اب وہ مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور نہیں رہا۔ رفعت کے نزدیک وہ محض انور تھا۔ سول سروس کا ایک اعلیٰ عہدیدار جو اگلے ماہ اس سے شادی کرنے والا تھا۔ کیونکہ رفعت، جس کے لیے زندگی ایک مسلسل جذباتی اضطراب تھی، اس کے تعاقب میں کامیاب ہو چکی تھی۔

رفعت ماہِ عسل منانے کے لیے گلمرگ چلی گئی۔ افروز اپنے گھر والوں کے ساتھ حسب معمول مسوری جا رہی تھی۔

زرد چاند بہت دیر تک اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد شوالک کی پہاڑیوں کی لکیر کے پیچھے جا چھپا اور دہرہ ایکسپریس کے اندھیرے کمپارٹمنٹ میں وہ اس ادھیڑ اور باتونی کرنل کی مسلسل آواز سے جاگ اٹھی جس نے اپنا تعارف اپنے ہم سفروں سے کرنل بھروچہ یا چڈہ یا باٹلی والا اسی قسم کے کسی خوب

صورت سے نام سے کرایا تھا۔ وہ بے حد عمدہ اردو بول رہا تھا اور اپنے خیال میں کوئی بہت ہی ضروری نکتہ بیان کر کے جو نشی سے اور اچھے لہجے میں فارسی کا کوئی شعر پڑھ ڈالتا تھا۔ اس نے کھڑکیوں میں سے آتی ہوئی رات کی خنک ہواؤں سے بچنے کے لیے ساری کا آنچل چہرے پر ڈال لیا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''استغفراللہ! میں نے کہا، کیا قیامت ہے، مسلمان عورت کو شراب پلا رہے ہو۔ قائدِ اعظم کے پان اسلامک نظام کے اخلاقی اور مذہبی ستونوں کا کیا حشر ہوگا۔ جواب ملا، بندہ نواز! ایں ہندوستان نباشد۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے اور یہ قاہرہ کی راتیں ہیں جہاں کی مسلمان عورتیں اپنی زندگی اور اخلاقی قدروں کو الزبتھ آرڈن اور میکس فیکٹر کے ڈبوں میں ایئر ٹائٹ کروا کے پیرس اور نیویارک سے منگواتی ہیں اور پھر ہمارے لڑکے — میں کہتا ہوں عیش کر لینے دو۔ ساقی سیمیں اور لب ہائے لعلیں کے شعر پڑھتے پڑھتے ختم ہوگئے — خوب پیتے ہیں — خوب ٹھاٹھ کرتے ہیں — بڑے بڑے شوہروں کی بیویاں اور اونچے اونچے باپوں کی بیٹیاں ان کے ساتھ قونصل خانے کے بال روم کی مرمریں ستونوں والی رقص گاہوں اور نیل کے روپہلے ساحلوں پر ان کے ساتھ ناچتی ہیں اور ہمارے لڑکے سب کچھ بھول کر ان وقتی لہروں کے ریلے میں بہتے جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں ارے بیٹا، آج کل تمھارے تجربوں کے لیے اچھا زمانہ ہے۔ جنگ جاری ہے۔ لڑائی کے میدان سے اپنی میڈیسن اور سرجری کے ایسے ایسے نئے تجربے حاصل کر سکتے ہو جو پہلے کبھی نہ ملے تھے اور نہ اب آئندہ مل سکیں گے — پر انھیں کچھ پروا نہیں۔ میں سوچتا ہوں: چلنے دو۔ سب ٹھیک ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے اور پھر یہ لڑکیاں — جو آپ کے چپراسیوں کے پنکھوں کی طرح کمر کے گرد دوپٹوں کے کراس بنائے اڑی پھرتی ہیں۔ یہ آندھی تو بھائی جان سب کو بہائے لیے جا رہی ہے۔ کہاں تک اس سے بچ پاؤ گے؟'' اور اس کے ایک ساتھی نے کہنا چاہا: ''لیکن کرنل — '' اور کرنل نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

''سیکس Sex be damned my dear Sir۔ یہاں جو بات ہے وہ ہے، اسے گلاس کیس میں چھپا کر رکھ دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟''

اُف — کیا لغویت ہے — اس نے سوچنا چاہا۔ کرنل اسی طرح باتیں کرتا رہا۔ رات کے خاموش اندھیرے میں پہیوں کے شور کی متوازن یکسانیت کرنل کی کرخت آواز سے مل جل کر بڑا ناگوار سا اثر پیدا کر رہی تھی۔ یا اللہ! زندگی کتنی ذلیل چیز ہے! اور کرنل کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

''مشرقِ وسطیٰ میں مقیم ہندوستانی فوجوں کو محظوظ کرنے کے لیے ہندوستان سے جو ڈانسنگ پارٹی گئی تھی اس میں لاہور کی ایک ہندوستانی عیسائی لڑکی ریحانہ بھی تھی۔

''مجھ سے پوچھا گیا، کرنل صاحب، آپ خاص قسم کا پرائیویٹ پرفورمینس بھی پسند کریں گے؟ میں نے کہا، بندہ نواز مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

''ایں — کیوں؟ ہی ہی ہی۔ ریحانہ مجھ سے ملی تو کہنے لگی: کرنل صاحب، آپ کے ہم نام ایک ڈاکٹر لاہور چھاؤنی میں بھی ہوا کرتے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے بے چارے۔ سنا ہے مر گئے۔ میری ماما ان کے ہسپتال میں نرس تھیں۔ بہت تعریف کیا کرتی تھیں ان کی۔ پر میں تو بہت چھوٹی تھی جب۔ میں نے ہنس کر کہا: مکرمہ! وہ تمھارے بڑے ہونے کا انتظار کرنے سے پہلے ہی کیسے مر سکتے تھے؟ ہی ہی ہی — کیوں؟ کیا خیال ہے تمھارا؟''

افروز نے پھر سونے کی کوشش کی۔ کرنل کہتا رہا: ''روی چیف آف دی اسٹاف کے ساتھ کئی سائے والیاں بھی تھیں۔ امریکن قونصل کی لڑکی کہنے لگی: ''کرنل تم بہت فضول آدمی ہو، باتیں بہت کرتے ہو۔ پہلے ہمارے زکام کا علاج کرو۔''

''میں نے کہا، فضول سہی، لیکن مکرمہ، جب سر میں درد ہوتا ہے تو ہم ہی یاد آتے ہیں۔ وہ کہتی تھی کلکتے اور شملے میں میں تم ہندوستانیوں سے ملتے ہوئے ذرا ہچکچاتی تھی۔ لیکن یہ قاہرہ ہے اور یہاں کی راتیں بہت گرم ہوتی ہیں اور ''شرارت'' کی خوشبو میں بہت تیز۔''

ہوا افروز کا آنچل اڑا رہی تھی۔ ٹرین چلتی رہی۔ کرنل کہہ رہا تھا: ''ابھی بیگمات اودھ نینی تال اور مسوری سے واپس نہیں آئی ہیں۔ ذرا بارشوں کے بعد لکھنؤ میں رونق آ جانے دو۔ خاکسار ایک کوک ٹیل پارٹی اور ایک ٹی ڈانس نہ چھوڑے گا۔ بھائی جان، خوب جانتا ہوں زندگی کا تعاقب کہاں تک کرنا چاہیے۔ میرا بڑا لڑکا بھی لفٹننٹ کرنل ہے اور اسے بھی معلوم ہے اور مجھے بھی کہ جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے، ہم دونوں اپنے اپنے راستوں پر اطمینان سے چل رہے ہیں اور ہمارے راستے کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں کاٹ سکتے۔''

اور ٹرین کی رفتار ایک اسٹیشن کے کہر آلود دھندلکے میں داخل ہوتے ہوئے دھیمی ہوگئی اور وہ اپنے ہم سفروں کو خدا حافظ کہتا ہوا پلیٹ فارم پر اُتر گیا — زندگی کے تعاقب میں، افروز نے سوچا اور کرنل کے جانے کے بعد اس کا ایک دوست دوسرے دوست سے کہہ رہا تھا: ''کرنل کی باتیں سن کر تم نے خیال کیا ہوگا کہ یہ اعلیٰ درجے کا لفنگا شخص ہے، لیکن واقعہ یہ ہے بھائی جان کہ اس سے زیادہ شریف اور پرخلوص آدمی دنیا میں ہی نہیں مل سکتا۔ اگر تم رات کے دو بجے اسے بلاؤ تو اپنا بیگ سنبھالے ننگے پاؤں بھاگتا ہوا پہنچ جائے گا۔ یہ جو کچھ کہتا یا ظاہر کرتا ہے محض اپنا اور دوسروں کا جی خوش کرنے کے لیے۔ بیوی مر چکی ہے، بڑا لڑکا بھی لفٹننٹ کرنل ہے اور ایک داماد آئی سی ایس۔ تین لڑکیاں انگلینڈ میں ہندوستانی فوجوں کے لیے کینٹین چلا رہی ہیں۔''

اور ٹرین چلنے لگی۔ کمپارٹمنٹ میں پھر اندھیرا ہوگیا۔ افروز نے آنکھوں پر

ہاتھ رکھ لیے اور اسے منظر احمد یاد آ گیا جو جلیس سے شادی کر کے اپنی نئی کار پر کشمیر جا کر ماہ عسل منانے کے پروگرام بنانے میں مصروف تھا اور اس وقت اس کو ایک بڑا پرمسرت، پرسکون سا احساس ہوا اس کا ستون اب بھی سب سے علاحدہ اور سب سے بلند ہے۔ زندگی کی اس تگ ودو، اس کشاکش سے بے نیاز اور بے تعلق زندگی کی یہ مسلسل چلو پکڑو، جانے نہ پائے، چڑیاں اور کوے، "تتلیاں اور بھونرے، ڈھولک پر" جیسے پتنگ پیچھے ڈور" گاتی ہوئی سبز آنکھوں والی جولیٹ اور اس کے پیچھے نواب، نشاط اور اس کے افسانے، رفعت اور اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی منظر احمد کی تیز رفتار اسپورٹس کار، روی چیف آف دی اسٹاف کی سائے والیاں اور ان کے پیچھے ان کے زکام اور دردسر کا علاج کرتا ہوا دل شکستہ کرنل چڈہ یا بھڑ دچہ یا ہانڈہ جس کی بیوی مر چکی ہے اور جس کا بیٹا بھی لفٹنٹ کرنل ہے اور داماد آئی. سی. ایس. اور جو ناعاقبت اندیش، ناتجربہ کار نوجوان ڈاکٹروں کو مشورہ دیتا ہے کہ بہترین موقع ہے میڈیسن اور نرسری کے تجربوں کا، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھالو، نیل کے ساحلوں پر خوب ناچ لو، پھر کہاں یہ جنگ ہوگی، کہاں تم اور کہاں قاہرہ کی راتیں۔ دراصل وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ یہاں سب بہت اچھے آدمی ہیں، ایک دوسرے کا خیال کرنے والے، ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں۔ سب اپنے اپنے محور پر تیزی سے گھوم رہے ہیں اور جوان کی لپیٹ میں آجاتا ہے وہ بھی اسی تیزی سے گھومنے لگتا ہے اور اس بھاگتی ہوئی دنیا میں صلاح الدین محمود اور مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور کے تخیلی کرداروں کی قطعی کوئی جگہ نہیں۔

اور پھر یک لخت اسے ایک بے حد عجیب خیال آیا: نہایت شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ کھڑکی میں سے پکار کر کہے: کرنل چڈہ، ادھر آؤ، میری بات سنو، تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ میری بات سنتے جاؤ۔ خوب زور زور سے چلائے: کرنل چڈہ، کرنل بھڑ دچہ، کرنل ہانڈہ!

لیکن کرنل کب کا پلیٹ فارم کے دھندلکے میں کھو چکا تھا۔

اور مونالیزا کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بکھر گیا جیسے وہ یہ سب بہت پہلے سمجھ چکی ہے۔

□□□

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش وکوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیات عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت ومودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا، ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصنافِ سخن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے

گلشن بے خار

مصنف: نواب مصطفٰے خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے بہ زبانِ فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آئے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو حقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

اردو خبرنامہ

جنگ آزادی 1857 میں اردو زبان کا کردار

● دربھنگہ، 6اپریل اردو کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے انگریزوں کی بیڑیوں میں جکڑے ملک ہندوستان کو آزادی دلانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے جنگ آزادی کے لیے پھانسی کے پھندے کو چومنے سے گریز نہیں کیا۔ ان خیالات کا اظہار گذشتہ روز وزیر ریلوے لالو پرساد یادو نے دربھنگہ میں دوروزہ قومی سیمینار ''جنگ آزادی 1857 میں اردو زبان کا کردار'' کا افتتاح کرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی میں جس طرح اردو زبان کے شاعر، ادیب اور صحافیوں نے حصہ لیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اگر یہ زبان نہ ہوتی تو ملک گیر پیمانہ پر جنگ آزادی کا بگل نہ بجتا۔ جناب لالو پرساد یادو نے اردو کو ایک طبقے کی جانب سے مسلمانوں کی زبان قرار دینے اور اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک کرنے پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اردو کسی مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ اردو مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی علامت ہے۔

جناب لالو پرساد یادو نے صرف کرسی کو ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہا کہ اقتدار کی خاطر ملک کا بٹوارہ ہوا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آزادی کے بعد سے مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور آج مسلمان تمام شعبۂ حیات میں پسماندگی کے شکار ہیں۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ریلوے میں ملازمین کی تعداد 16 لاکھ ہے جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف 35ہزار ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک مسلمانوں کے ساتھ کی گئی ناانصافی کو دور نہیں کیا جاتا اس وقت تک ہندوستان میں اچھے معاشرے کی تعمیر کا خیال عبث ہے۔

مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب محمد علی اشرف فاطمی نے جنگ آزادی میں اردو کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی، مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی تھی جو اردو کے بہترین شاعر بھی تھے اور پھر یہ سلسلہ 1947 تک جاری رہا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے اردو صحافیوں نے جس طرح قربانیاں دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ یہ فخر اردو کو ہی حاصل ہے کہ پہلا صحافی جو شہید ہوا وہ مولوی محمد باقر تھے۔

مشہور شاعر اور فلمی نغمہ نگار جناب حسن کمال نے 1857 کی جنگ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دو زبانیں رائج تھیں ایک حاکم کی زبان جو کہ انگریزی تھی دوسری محکوم کی زبان جو اردو تھی۔ اسی اردو زبان نے محکوم کو حاکم کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا کہ 1857 کی جنگ آزادی کے حالات دو زبانوں میں ہمارے سامنے آئے ایک انگریزی اور دوسری اردو، انگریزی میں جو کچھ اس وقت لکھا گیا تھا وہ انگریزوں کا نظریہ تھا جو اس جنگ آزادی کو غدر کہتے ہیں۔ انھوں نے اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر اردو زبان نہ ہوتی تو ہم 1857 کے بارے میں حقیقی صورت حال کبھی نہ جان پاتے۔

برصغیر کے مشہور شاعر احمد فراز نے اپنی نظم ''شہدائے جنگ آزادی'' سنائی جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ دوروزہ قومی سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر امام اعظم نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا جس میں انھوں نے دربھنگہ کی ادبی تاریخ پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ دوروزہ قومی سیمینار کی پہلی نشست میں جو مقالے پڑھے گئے وہ ''1857 سے متعلق دستاویزات اور لسانی اور ادبی نقوش'' سے متعلق تھے پروفیسر خالد سعید، عمر آصف، آفتاب اشرف، مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر حسین احمد نے اس موضوع کی تمام جہتوں کا احاطہ کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ڈین پروفیسر خالد سعید نے نہایت پرمغز مقالے میں آزادی کے مختلف مفاہیم کی تعبیر پیش کی اور آزادی کے تصور کو ایک دوسرے سے متضاد اور متخالف قرار دیا۔

مشہور شاعر عبدالمنان طرزی نے بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے منظوم مقالہ پیش کیا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ 29؍مارچ کا پہلا اجلاس ''اردو میں مجاہد رہنما اور عوام کے وطنی جذبات وخیالات'' کے لیے مختص تھا اس نشست میں پروفیسر مجید بیدار (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) ابوذر ہاشمی (نیشنل لائبریری کلکتہ)، منصور عمر، پروفیسر فاروق احمد صدیقی، فیاض احمد وجیہ، عطا عابدی، مناظر عاشق ہرگانوی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر نسرین سلطانہ، عابد انور اور دیگر افراد نے مقالے پڑھے۔ حقانی القاسمی نے ''کالا پانی کے سزا یافتگان'' پر مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے آزادی کی نئی تفہیم وتعبیر پر زور دیتے ہوئے 1857 کے متعلق بیشتر کتابوں کو انتقامی نفسیات، مذہبی تعصبات مغالطہ اور مبالغہ آرائی پر مبنی قرار دیا۔ انھوں نے انگریزوں کی اس سائیکی کی جستجو کی اور ذہنی سلسلے کو دریافت کیا جس کا سلسلہ عہد حاضر سے جڑا ہوا ہے۔ حقانی القاسمی نے آزادی کے تصور کی تفہیم عصری تناظر کے حوالے سے کی اور آزادی کے مختلف معانی و

مطالب بیان کرتے ہوئے تصور آزادی کے سلسلے میں ایک نئے ڈسکورس کی ضرورت پر زور دیا۔

صحافت اور سامراجیت 1857 کے تناظر کے عنوان سے اپنے مقالے میں عابد انور نے اردو صحافت کے انقلابی کردار اور سامراجیت کے منفی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے ٹیپو سلطان کے اخبار "فوجی اخبار" کو جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز قرار دیا اور ملک بھر میں اردو اخبارات کے اہم کردار کے حوالے سے اخبارات کی استعماریت مخالف روش پر روشنی ڈالی اور کہا کہ 1857 انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ایک علامت تھی اور اسے ملک گیر پیمانے پر جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز مانا جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر 1857 کے تناظر میں اردو اخبارات کے کردار کی بابت گفتگو ہورہی ہے مگر دیکھا جائے تو انگریزوں کے خلاف اردو صحافت نے "فوجی اخبار" کے ذریعے جو بگل بجایا تھا اسے اردو صحافت نے فراموش کردیا ہے۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے خلاف سب سے پہلی آواز فوجی اخبار سے بلند ہوئی جو ٹیپو سلطان کے حکم سے جاری ہوا، یہ ٹیپو سلطان کے سرکاری مطبع سے شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار فوجیوں کے لیے تھا، ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے جس طرح ان کی تمام چیزیں لوٹ لیں، اسی طرح اس اخبار کی فائلیں بھی ضبط کرلیں۔ تیسرے اجلاس میں "اردو زبان و ادب پر برطانوی نو آبادیاتی نظام کے منفی اثرات" کے تحت صفی اختر، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (مشترکہ وراثت کے احیا میں لسانی و ادبی کوششیں)، احمد جاوید 1857 کے آس پاس دہلی کے اردو اخبارات)، ڈاکٹر صلاح الدین (19ویں صدی کی غزلیہ شاعری میں 1857 کا عکس)، ڈاکٹر برکت علی (جنگ آزادی سے پہلے شاعروں کا رویہ)، ڈاکٹر شمیم باری (اردو شاعری میں جنگ آزادی کی گونج)، ایس ایم اشرف فرید (1857 کے صحافتی رجحانات)، رضوان احمد (مشترکہ تہذیب ولسانی وراثت بذریعۂ اردو اخبارات)، ڈاکٹر انیس صدری (جنگ آزادی کے بعد کے اثرات)، محمد عزیز الاسلام (پہلی جنگ آزادی سے متعلق دستاویزات)، نے مقالات پڑھے اور نو آبادیاتی نظام کے منفی اثرات کا مکمل جائزہ لیا۔ صفی اختر نے 1857 کے آس پاس اردو اخبارات کے مضامین کے حوالے سے مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی کوئی بھی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ اردو صحافت سے تاریخ لکھنے والے استفادہ نہ کریں۔ اگر اردو صحافت نہ ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ سنی سنائی باتوں اور افواہوں سے مرکب ہوتی۔ غدر کے پہلے کے اخبارات کے اندر قوم کی بہبود کی فکر اور قومی غیرت موجود ہے اور اخبارات کے مضامین حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہیں۔ مجموعی طور پر تینوں نشستوں میں گفتگو جنگ آزادی میں اردو کے کردار پر مرکوز رہی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ریجنل سینٹر دربھنگہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد دو روزہ قومی سیمینار کے موضوع کے حوالے سے بہت سی نئی جہتیں سامنے آئیں۔ یہ دو روزہ سیمینار 28، 29 مارچ کو دربھنگہ شہر کے مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ میں منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار میں جہاں ملک و بیرون ملک سے شعرائے کرام تشریف فرما تھے وہیں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے بھی شرکت کی۔

(روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ)

فاصلاتی تعلیم وقت کی اہم ضرورت

● حیدرآباد، 2 فروری۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے قیام کے صرف 9 برسوں میں ملک بھر میں نظامت فاصلاتی تعلیم کی جڑوں کو وسیع، مضبوط اور مستحکم کرتے ہوئے ملک کی ان یونیورسٹیوں میں اپنا نام شامل کروالیا ہے جہاں فاصلاتی اور روایتی دونوں نظام تعلیم رائج ہیں۔ اس خیال کا اظہار وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان نے یونیورسٹی کے اکیڈمک اسٹاف اور ریجنل ڈائرکٹرز سے اپنے خصوصی خطاب کے دوران کیا۔ پروفیسر پٹھان نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اردو یونیورسٹی میں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کے فروغ پر بھی خصوصی توجہ دی جارہی ہے جس کے باعث یونیورسٹی کے طلبہ میں تقریباً 55% خواتین شامل ہیں۔ پروفیسر پٹھان نے ڈسٹنس ایجوکیشن کونسل کے تعاون سے منعقد کیے جانے والے اس پروگرام میں شرکت کرنے والے تمام مندوبین کو کامن ویلتھ آف لرننگ سے استفادے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اردو یونیورسٹی عنقریب اسٹڈی سنٹرز، ریجنل سنٹرز اور ہیڈ آفس کے مابین بہتر تال میل اور ہم آہنگی کو یقینی بنانے کے لیے ٹیلی کانفرنسنگ کی سہولتوں سے استفادہ کرے گی تاکہ انتظامی اور تعلیمی امور کی انجام دہی میں توازن قائم کیا جاسکے۔ پروفیسر پٹھان نے یونیورسٹی کے اساتذہ پر زور دیا کہ وہ تعلیمی نصاب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کریں تاکہ اردو یونیورسٹی کے طلبہ بھی دیگر زبانوں کے طلبہ کے ساتھ پوری طرح مسابقت کے قابل ہوسکیں۔ پروفیسر پٹھان نے اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ کی جانب سے تیار کی جانے والی نصابی کتابوں کو یونیورسٹی کے تعلیمی پروگراموں کی توسیع کی کلید قرار دیتے ہوئے کہا کہ ابتدا میں اس شعبے سے کیے جانے والے نصابی مواد کے تراجم میں کچھ دشواریاں درپیش تھیں کیونکہ 1948 میں جامعہ عثمانیہ کے ذریعۂ تعلیم کو تبدیل کیے جانے کے بعد 1998 میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد ہی اس کا احیا عمل میں آیا تھا۔ لیکن اب ان دشواریوں پر قابو پالیا گیا ہے۔ پروفیسر پٹھان نے یونیورسٹی میں قائم کیے جانے والے انسٹرکشنل میڈیا سنٹر کو نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کی توسیع کے لیے ایک اہم قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سنٹر کے بہترین آڈیٹوریم اور اسٹوڈیو

سے کیمپس ایجوکیشن کے طلبا کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ انھوں نے یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کی جانب سے سب سے پہلے فاصلاتی نظام تعلیم کے پروگراموں کو شروع کرنے کے فیصلے کو ایک درست اقدام قرار دیتے ہوئے اس کی ستائش کی۔ قبل ازیں کنٹرولر امتحانات و ڈائریکٹر انچارج نظامت فاصلاتی تعلیم پروفیسر ایس.اے. وہاب قیصر نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس اورینٹیشن پروگراموں کو ایک ہمہ مقصدی پروگرام قرار دیتے ہوئے پروگرام میں شریک تمام اراکین کو 9 فروری تک جاری رہنے والے اس پروگرام کے مختلف اجلاسوں میں ''اوپن و ڈسٹنس لرننگ'' کے اہم موضوعات پر اس شعبے کے ماہرین کے ساتھ تبادلۂ خیال کی دعوت دی۔ پرووائس چانسلر و رجسٹرار انچارج ڈاکٹر کے. آر. اقبال احمد نے اس طرح کے پروگراموں کو فاصلاتی نظام تعلیم کے فروغ میں حائل دشواریوں کو حل کرنے کے لیے ضروری قرار دیا۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد، انچارج شعبۂ تعلقات عامہ نے افتتاحی اجلاس کی کارروائی چلائی جبکہ ڈاکٹر نکہت جہاں، لکچرر، نظامت فاصلاتی تعلیم نے کلمات تشکر پیش کیے۔ اس کے فوراً بعد پروفیسر ایس.اے. وہاب قیصر نے اس پروگرام کے پہلے اجلاس کی اپنے خصوصی خطاب کے دوران مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے آج تک نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت چلائے جانے والے تعلیمی پروگراموں کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے اسٹڈی سنٹرز اور ریجنل سنٹرز کے مابین تعاون پر زور دیا۔ پروگرام کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر پی فضل الرحمٰن، ریڈر نظامت فاصلاتی تعلیم نے ملک کی مختلف ریاستوں سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ریجنل ڈائرکٹرز کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں پروفیسر خالد سعید، پروفیسر سید شاہ محمد مظہر الدین فاروقی، پروفیسر ریکھا پانڈے، ڈاکٹر ایچ خدیجہ بیگم، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر محمد ظفر الدین، ڈاکٹر عباس خاں، ڈاکٹر شاہد پرویز (دہلی)، ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ (بنگلور)، ڈاکٹر امام اعظم (دربھنگہ)، ڈاکٹر عبدالرشید خاں (سرینگر)، جناب صاحب سنگھ (کولکاتا)، ڈاکٹر محمد ارشد اقبال (ممبئی)، ڈاکٹر محمد احسن (بھوپال)، ڈاکٹر حسنین حیدر (پٹنہ) اور تدریسی و غیر تدریسی شعبوں کے اراکین کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

غالب ڈسکورس اور ادبی تھیوری کے موضوع پر آٹھواں فراق یادگاری خطبہ

● نئی دہلی، 9 اپریل: معاملہ زندگی کا ہو یا مذہب کا، گناہ و ثواب کا ہو یا غم و خوشی کا غالب ہر جگہ پرانے تصور سے الگ ہٹ کر نئی شعری سچائیاں خلق کرتے ہیں اور اس میں وہ کئی مقامات پر زبان و بیان کی انتہائی حد پر نظر آتے ہیں۔ غالب کا جہان معنی تکثیری اسی لیے ہے کہ متعینہ معنی سے ہٹ کر وہ نیرنگئ معنی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار آج شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ایڈورڈ سعید ہال میں آٹھویں فراق یادگاری خطبے کے دوران ''غالب ڈسکورس اور ادبی تھیوری'' کے موضوع پر بولتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ چیرمین ساہتیہ اکادمی نے کیا۔ خطبے کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کی جبکہ پروفیسر قمر رئیس وائس چیرمین دہلی اردو اکادمی اور ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مہمانان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خطبے میں مزید کہا کہ غالب کی تحسین کے سلسلے میں کچھ بنیادی سوالات باقی ہیں جن کا جواب اردو تنقید و دانش کو فراہم کرانا ہے لیکن یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ روایتی تنقید کے پاس ان سوالات کا جواب نہیں ہے۔ انھوں نے نام بنام تمام ماہرین غالبیات کی خدمات کا ذکر کیا اور کہا کہ میں ان کو سلام کرتا ہوں لیکن غالب شناسی کے بعض پہلو ابھی تشنۂ بحث ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے چار بنیادی سوالات اٹھائے جن کا تعلق غالب کی انتہائی مشکل پسندی، فارسی سے ان کے عقیدت مندانہ شغف اور ان کے کلام منسوخ سے تھا۔ انھوں نے یہ بحث بھی اٹھائی کہ آخر کیا وجہ تھی کہ دو تہائی اردو کلام غالب نے کاٹ کر پھینک دیا۔

پروفیسر قمر رئیس نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خطبے کو بے حد وقیع خطبہ قرار دیا اور کہا کہ گذشتہ دو دہائیوں میں غالب شناسی اور غالب پر تنقید کے حوالے سے اس سے بہتر خطبہ انھوں نے نہیں سنا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کا یہ خطبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ 'غالب کو ہر دور میں نئے طریقے سے سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے یہاں بے پناہ تخلیقی زرخیزی ہے'۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ 'غالب کی شخصیت اور فن کی متعدد جہتیں ایسی ہیں جو ہنوز مطالعے کی منتظر ہیں۔ انھوں نے غالب کی ایک مستند سوانح کی اشاعت پر زور دیا'۔

ڈاکٹر کوثر مظہری نے ابتدا میں فراق کے فکر و فن کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ زندگی کے تمام تر تضادات اور انسانی ذہنوں کے ارتعاشات اگر ایک شخص میں دیکھنا ہو تو فراق کی شخصیت اور شاعری کو سامنے رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے قبل صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے تمام مہمانان کا استقبال کیا۔ جلسے کا آغاز حافظ محمد ریاض ثاقب نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور استاد ضمیر احمد خاں نے فراق کی ایک مشہور غزل اپنی مترنم آواز میں پیش کی۔

ڈاکٹر خالد محمود نے پرلطف انداز میں اظہار تشکر کیا۔ اہم شرکا میں پروفیسر ظفر احمد نظامی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر صغریٰ مہدی، پروفیسر شاہد حسین، ڈاکٹر شاہد پرویز، مرغوب حیدر عابدی، ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر عقیل احمد، متین امروہوی، منظور عثمانی، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر رئیس احمد، ڈاکٹر احمد کفیل، ملک زادہ جاوید، فصیح اکمل قادری، راشد عزیز، ڈاکٹر تنویر احمد، ڈاکٹر وسیم بیگم، ڈاکٹر خان احمد فاروق، عمیر منظر اور جاوید رحمانی کے علاوہ جامعہ کے مختلف شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ شامل تھے۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی میں دو روزہ قومی سیمینار

● چنئی، 14 اور 15 مارچ۔ کو یونیورسٹی آف مدراس کے شعبۂ اردو میں دوروزہ قومی سیمینار منعقد ہوا۔ ''اردو زبان و ادب کا سیکولر کردار'' اس سیمینار کا موضوع تھا۔ سیمینار کے موضوع اور زبان و ادب سے محبت رکھنے والے ہر طبقے کے لوگ جلسہ گاہ کی جانب کشاں کشاں چلے آئے اور مرینا کیمپس میں واقع پلاٹینم جوبلی آڈیٹوریم محبان اردو سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال کے اندر نشستیں خالی نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو باہر کھڑا ہونا پڑا اور بعض سامعین کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اس کو محسوس کرتے ہوئے گورنر شری برنالا نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ سامعین کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے منتظمین سیمینار کو بڑا ہال لینا چاہیے تھا۔

افتتاحی جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد شال پوشی کی رسم ادا کی گئی شعبۂ عربی، فارسی، اردو کے استاد ڈاکٹر پی. نثار احمد نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور تمام مہمانوں اور سیمینار کے مندوبین کا استقبال کیا۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین نے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے گورنر تمل ناڈو شری سرجیت سنگھ برنالا کو اردو کا زبردست حامی اور بہی خواہ قرار دیا۔ انھوں نے مہمانان اعزازی نواب محمد عبدالعلی، پرنس آف آرکاٹ، مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر، راما چندرن اور پروفیسر م.ن. سعید، چیئرمین کرناٹک اردو اکادمی کا پُرجوش خیر مقدم بھی کیا۔

ڈاکٹر م.ن. سعید نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو زبان و ادب میں موجود سیکولر عناصر پر روشنی ڈالی اور کہا کہ سیکولرزم کی اصطلاح تو بیسویں صدی کی اختراع ہے لیکن اردو زبان کے خمیر میں یہ شروع ہی سے شامل ہے اور اس کے مزاج کا حصہ ہے۔ اردو زبان و ادب کے اس مثبت پہلو کو فروغ دینے کی ضرورت ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر وقت کا اہم تقاضا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چودھویں صدی عیسوی میں حضرت امیر خسرو نے جو عوامی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں کہی ہیں، ان میں سیکولرزم کے اولین نقوش موجود ہیں۔ انھوں نے دکنی کی قدیم مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' حکمت گرو ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف ''نورس'' اور نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں موجود سیکولر عناصر کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ تقسیم ہند کے وقت اور اس کے بعد پیدا شدہ فرقہ وارانہ تنگ نظری کے ماحول میں بھی اردو زبان و ادب نے اپنا سیکولر کردار برقرار رکھا۔

مہمان خصوصی پرنس آف آرکاٹ نواب محمد عبدالعلی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ اردو کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ وہ دلی میں پیدا ہوئی، لکھنؤ میں جوان ہوئی اور حیدرآباد میں بوڑھی ہوئی لیکن مدراس کے اردو داں طبقے نے اسے توانا و جوان بنائے رکھا ہے۔

مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر راما چندرن نے اپنے خطاب میں اردو کی اہمیت اور مقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ یہ سیمینار اردو ادب کے سیکولر عوامل کا بھرپور جائزہ لے گا۔

گورنر تمل ناڈو شری سرجیت سنگھ برنالا نے اپنے افتتاحی خطبے سے سامعین کے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ گورنر موصوف نے بتایا کہ انھیں اردو سے بے پناہ محبت ہے اور وہ 1940 میں میٹرک کا امتحان اردو میں لکھ کر کامیاب ہوئے تھے۔ اب 60 سال بعد انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اردو بھول چکے ہیں لیکن جب انھیں اپنی انگریزی کتاب Quest for Freedom کا اردو ترجمہ کرنے کا خیال آیا تو انھیں ایسا لگا کہ وہ اردو زبان کو بھولے نہیں ہیں، انھیں سب کچھ یاد ہے اور اردو زبان کوئی ایک بار پڑھ لیتا ہے تو وہ اسے بھول نہیں سکتا۔

اس موقع پر تمل ناڈو کی مشہور و معروف پردہ نشیں خاتون فنکار امیر النساء صاحبہ کی تازہ تخلیق ''سرحد کے اس پار'' کی رسم رونمائی گورنر آف تمل ناڈو کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ کتاب کی پہلی کاپی نواب محمد عبدالعلی، دوسری کاپی جناب اے. محمد اشرف اور تیسری کاپی جناب کے. انیس احمد کو پیش کی گئی۔ اس کتاب سے متعلق گورنر موصوف نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس کتاب کو الف سے ی تک پڑھا ہے اور اس کتاب سے مصنفہ کی محنت، لگن، ذوق و شوق اور مشاہدے کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر اردو داں کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تقریباً 40 منٹ تک گورنر سامعین سے مخاطب رہے۔

شعبۂ اردو کے سینئر لکچرر ڈاکٹر کے. قاضی حبیب احمد کے ہدیۂ تشکر پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

اردو یونیورسٹی میں ایڈیشنل اسٹاف کالج کا افتتاح

● حیدرآباد، 26 مارچ۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک ایسی عظیم

جامعہ کی حیثیت سے فروغ پذیر ہے جہاں تحقیق وتدریس کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کو بھی پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر مول چند شرما، نائب صدر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے احاطے میں اکیڈمک اسٹاف کالج کا افتتاح انجام کرنے کے بعد بہ حیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب کے دوران کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے صدارت کی۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے پروفیسر شرما نے کہا کہ اردو یونیورسٹی ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں جدید علوم کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے پیشہ ورانہ ماہرین کو تیار کیا جا رہا ہے۔ اردو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اردو زبان کے پیشہ ورانہ ماہرین کی نشاندہی اور ان کی خدمات کے حصول کے ذریعے اردو یونیورسٹی نے اپنے مختصر سے سفر میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ پروفیسر شرما نے کہا کہ سچر کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں وزارت فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کی جانب سے اقلیتوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی فراہمی اور پیشہ ورانہ کورسز میں مناسب نمائندگی دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے جانے والے ہیں تاہم اردو یونیورسٹی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس یونیورسٹی میں تشنگان علوم وفنون عصری تعلیمی تقاضوں کے ساتھ زیورِ علم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ اردو زبان میں جدید علوم کی منتقلی کسی چیلنج سے کم نہیں لیکن اردو یونیورسٹی اس چیلنج کا انتہائی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہے جس کے لیے وائس چانسلر پروفیسر اے.ایم. پٹھان مبارکباد کے مستحق ہیں جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے شروع کی جانے والی کسی بھی تعلیمی اسکیم کی اردو یونیورسٹی میں فی الفور عمل آوری کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تمام اراکین سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے بہر قیمت اس کی منظوری کو یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر شرما نے کہا کہ محنت شاقہ اور جہد مسلسل ہی اردو والوں کو دیگر زبانوں کے ساتھ مسابقت کے قابل بنا سکتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ پیشہ ورانہ مہارت کے حامل اسکالرز کی خدمات سے استفادہ کرتے ہوئے جدید علوم کے تراجم کیے جائیں اور معیار پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ ہو۔ انھوں نے اصطلاحات میں ترمیم وتبدیلی سے احتیاط برتنے کا مشورہ دیتے ہوئے انھیں من وعن استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی میں اکیڈمک اسٹاف کالج کا قیام ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہے تاکہ پیشہ ورانہ ماہرین کو آج کے دور کی مسابقت کے قابل بنایا جا سکے۔ پروفیسر شرما نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پروگراموں کے لیے ہر ممکنہ تعاون دینے کا یقین دلاتے ہوئے اردو یونیورسٹی میں اکیڈمک اسٹاف کالج کے قیام میں پروفیسر جے.اے.کے. ترین اور پروفیسر کے. راما موورتی نائیڈو کی خدمات کی ستائش کی۔ انھوں نے اس موقع پر اکیڈمک اسٹاف کالج کی جانب سے منعقد کیے جانے والے پہلے اورینٹیشن پروگرام کا افتتاح انجام دینے کے علاوہ لکچر ہال کامپلکس کا بھی افتتاح کیا۔ پروفیسر کے راما موورتی نائیڈو، ممبر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس موقع پر اپنے خطاب میں پیشۂ تدریس کو ایک باعظمت پیشہ قرار دیتے ہوئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کے فروغ اور تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کو قابل ستائش قرار دیا۔ پروفیسر نائیڈو نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد یونیورسٹی کے بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اکیڈمک اسٹاف کالج کا قیام اردو یونیورسٹی کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے کیونکہ اردو یونیورسٹی میں قائم کیا جانے والا یہ ملک کا 53واں اور اردو کا پہلا اکیڈمک اسٹاف کالج ہے۔ پروفیسر نائیڈو نے کہا کہ یو جی سی کی جانب سے اکیڈمک فریڈیم کے لیے خود مختار اداروں کے قیام کے علاوہ اورینٹیشن پروگرامس اور ریفریشر کورسز کے انعقاد کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ نئے اور پرانے اساتذہ جدید علوم اور تعلیم کے نئے میلانات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ پروفیسر اے.ایم. پٹھان نے اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر مول چند شرما کی جانب سے دیے جانے والے تمام مشوروں پر عمل آوری کا یقین دلاتے ہوئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے اردو یونیورسٹی میں اکیڈمک اسٹاف کالج کے قیام کو فال نیک قرار دیا۔ انھوں نے ملک بھر کے تمام اردو والوں کی جانب سے پروفیسر مول چند شرما، پروفیسر کے. راما موورتی نائیڈو اور پروفیسر جے.اے.کے. ترین کے علاوہ ان تمام اراکین کا شکریہ ادا کیا جن کی کوششوں کے باعث اردو یونیورسٹی میں اس کالج کا قیام ممکن ہوسکا۔ (ڈاک سے)

انجمن ترقی اردو ہند گلبرگہ کا جلسہ تقسیم انعامات

● گلبرگہ، 25 مارچ۔ ''کوئی بھی تعلیمی ادارہ ہو یا سوسائٹی ہو اس کے ذمہ داران کو معیار تعلیم پر بھر پور توجہ دینی چاہیے۔ اس معاملے میں کوتاہی برتی گئی تو قوم وملت کو زبردست نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا''۔ ان خیالات کا اظہار سابق وزیر کرناٹک الحاج قمر الاسلام نے بہ حیثیت مہمان خصوصی انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے جلسۂ تقسیم انعامات میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کی تہذیب اور کلچر پر فلموں کے اثرات تیزی سے مرتب ہو رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں انجمن ترقی اردو گلبرگہ اردو کے تحریری، تقریری اور بیت بازی مقابلے منعقد کروا کر اردو کی تہذیب کو زندہ رکھنے اور اردو کے طلبہ وطالبات کی ہمت افزائی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

الحاج قمر الاسلام نے کہا کہ اضلاع حیدرآباد وکرناٹک میں بے شمار

مدارس ہیں لیکن علامہ اقبال ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت شاہین اسکول اردو میڈیم نے اعلیٰ تعلیمی معیار قائم کیا ہے۔ 2002 سے 2007 کے دوران اس اسکول نے کافی ترقی کی ہے۔ اسی طرح گلبرگہ کی ہیومن ایج اسوسی ایشن بھی ایک معیاری اردو میڈیم گلشن اطفال اسکول چلا رہی ہے۔ الحاج قمر الاسلام نے کہا کہ حکومت سے زیادہ امید نہیں رکھنی چاہیے۔ خوشامدانہ رویہ ترک کر دینا چاہیے۔ اس بار کرناٹک کے بجٹ میں جہاں دیگر زبانوں کی ترقی کے لیے کروڑوں روپے مختص کیے گئے ہیں وہاں اردو زبان اور اردو اکادمی کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ حکومت نے اردو کے ساتھ ساتھ بجٹ میں ریاست کے دو ہزار سے زائد مسلم اوقافی اداروں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

قبل ازیں مہمان خصوصی جناب ایم۔ اے۔ حکیم شاکر نے ضلعی سطح پر روزنامہ ''سیاست'' کی جانب سے حیدرآباد کرناٹک کی سطح پر ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی۔ (اردو میڈیم) میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو گولڈ میڈل اور سلور میڈل پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے تحت انعامات دینے اور اردو کے طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی کرنے کا یہ سلسلہ قابل ستائش ہے۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ ہر سال اردو کے ہونہار طلبہ و طالبات کو انعامات سے نوازنے کے لیے پروگرام منعقد کرتی ہے۔ اس طرح کی مثال جنوبی ہند کے دیگر شہروں میں بہت کم ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ الحاج قمر الاسلام ادارہ روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے علاوہ دیگر ادارہ جات جو اردو کے ہونہار طلبہ و طالبات کو انعامات سے نواز رہے ہیں وہ تمام مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر سید رحمت اللہ معتمد البدر ٹرسٹ نے بہ حیثیت مہمان خصوصی اپنی تقریر میں انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ہونہار طلبہ و طالبات کو انعامات سے نواز کر انجمن بے شک ایک اعلیٰ خدمت انجام دے رہی ہے۔

قبل ازیں جلسے کا آغاز سید علیم اللہ حسینی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ معتمد انجمن جناب خواجہ پاشاہ انعامدار نے جلسے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر جلیل تنویر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ معتمد تعلیمی امور محمد مجیب احمد نے انعامات حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کے ناموں کا اعلان کیا۔ الحاج قمر الاسلام نے اینگلو اردو ہائی اسکول ٹاؤن شپ ڈانڈیلی کی طالبہ لبنیٰ فاروقی کو ایس۔ ایس۔ ایل۔ سی۔ (اردو میڈیم) میں ریاست بھر میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرکے کامیاب ہونے پر 5000 روپے کے شخصی انعام سے نوازا۔ شاہین اسکول بیدر کی طالبہ روبینہ انجم کو انعام اول اور گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ یہ گولڈ میڈل ہر سال روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد کی جانب سے حیدرآباد کرناٹک کی سطح پر اردو میڈیم میں اعلیٰ نشانات حاصل کرنے والوں کو دیے جاتے ہیں۔ شاہین اسکول بیدر کے طالب علم سید تاج الدین اور سید عرفان احمد کو سلور میڈل سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر سید رحمت اللہ نے البدر ٹرسٹ کی جانب سے نیشنل ہائی اسکول کے طالب علم فضل محمد کو ضلعی سطح پر زیادہ نشانات حاصل کرنے پر انعام اول، الامین ہائی اسکول جیورگی کالونی کی طالبہ حنا گوہر کو انعام دوم اور اسی اسکول کی طالبہ فرحانہ انجم کو انعام سوم سے نوازا۔ گلبرگہ سے زبان اردو میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے پر انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کی جانب سے الامین ہائی اسکول جیورگی کالونی کی طالبہ نصرت جہاں کو انعام اول، سمیہ آفرین نیشنل گرلز ہائی اسکول، بی بی فاطمہ الامین ہائی اسکول جیورگی کالونی اور شاہین الامین ہائی اسکول جیلان آباد کو انعام دوم، نیشنل ہائی اسکول کے طالب علم فضل محمد، فرحانہ انجم الامین ہائی اسکول کیورگی کالونی، عائشہ جبین بی بی رضا گرلز ہائی اسکول، خدیجہ جبین جواہر ہند ہائی اسکول، محمد عقیل احمد نیشنل ہائی اسکول گلبرگہ کو انعام سوم سے نوازا گیا۔ انجمن کی جانب سے تقریری و تحریری اور بیت بازی کے مقابلوں پر بھی انعامات دیے گئے۔

(ڈاک سے)

بہار میں اردو افسانہ نگاری پر سیمینار

● دربھنگہ، 17 مارچ۔ شعبۂ اردو ملت کالج، دربھنگہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے 17 مارچ 2007 کو ملت کالج، دربھنگہ کے لکچر ہال میں یک روزہ قومی سیمینار بہ موضوع ''بہار میں اردو افسانہ نگاری'' منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کے مقرر خاص پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ ہماری زندگی کے تمام نشیب و فراز آج کے اردو افسانوں میں سمٹ آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے افسانے ہماری سماجی زندگی کی تنقید کا بہترین ذریعہ بن گئے ہیں۔ اگر افسانے کے نقاد افسانہ نگاروں کے انفرادی اوصاف کی تلاش و جستجو میں اپنی ذہانت کو شامل کریں تو افسانے کی بوطیقا تیار ہو سکے گی اور ہر افسانہ نگار کی علاحدہ شناخت قائم ہو سکے گی۔ جلسے کے مہمان خصوصی پروفیسر ایم۔ ایل۔ ٹھاکر، وائس چانسلر، ایل۔ این۔ میتھلا یونیورسٹی، دربھنگہ نے کہا کہ اردو زبان نے ہماری مشترکہ تہذیب کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لیے اردو کی ترقی کے لیے بغیر کسی بھید بھاؤ کے ہر ایک ہندوستانی کو آگے آنا چاہیے۔ ڈاکٹر پرشاد، رجسٹرار، ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی نے کہا کہ اردو اور ہندی میں صرف رسم الخط کا فرق ہے اور اردو رسم الخط ہی اس کی اصل شناخت ہے۔ اس زبان نے ملک کی تاریخ میں کئی باب کا اضافہ کیا ہے۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر مشتاق احمد، استاد شعبۂ اردو ملت کالج نے سیمینار کے موضوع ''بہار میں اردو افسانہ نگاری'' پر تفصیلی روشنی ڈالی اور آج کے عہد کو اردو فکشن کا عہد قرار دیتے ہوئے بہار کی

ادبی اور علمی اہمیت کو واضح کیا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ایس.ایم. رضوان اللہ نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ملت کالج کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ افتتاحی جلسے کے صدر پروفیسر سی.ایم. عالم نے اس سیمینار کو ایک اہم سیمینار قرار دیتے ہوئے، شرکائے سیمینار کا شکریہ ادا کیا۔ اجلاس اول کی مجلس صدارت میں پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر عبدالمنان طرزی اور شفیع جاوید شامل تھے جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ندیم احمد نے انجام دیے۔ اس اجلاس کے مقالہ خوانوں میں پروفیسر محمد غیاث الدین (مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد، مہاراشٹر) میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی (مظفر پور)، ڈاکٹر ریاض احمد (جموں)، ڈاکٹر محمد کاظم (دہلی)، ڈاکٹر فرحت شمیم (جموں)، ڈاکٹر افسر کاظمی (جمشید پور)، ڈاکٹر صفدر امام قادری (پٹنہ)، جاوید رحمانی (دہلی) ڈاکٹر انیس صدری، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر شہاب ظفر اور مشتاق احمد نوری (پٹنہ) شامل تھے۔

دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر محمد غیاث الدین، پروفیسر فاروق احمد صدیقی شامل تھے۔ اس اجلاس میں مقالہ پڑھنے والوں میں ڈاکٹر سہیل اختر، ڈاکٹر نسرین سلطانہ، ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر نکہت افشاں، ڈاکٹر محسن رضا رضوی، عطا عابدی، خالد عبادی، ارتضیٰ احمد اور محمود فرید شامل تھے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی۔ اختتامیہ اجلاس کی صدارت پروفیسر ایس.ایم. رضوان اللہ نے کی جبکہ پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر عبدالمنان طرزی، شفیع جاوید اور مشتاق احمد نوری نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد، کنوینر سیمینار نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور یہ اعلان کیا کہ جتنے مقالے پڑھے گئے ہیں انھیں جلد ہی کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ سیمینار کے شرکا میں پروفیسر اویس احمد دوراں، حسن امام درد، پروفیسر عبداللطیف، پروفیسر خلیل الرحمٰن سلفی، پروفیسر اشفاق اشرف، پروفیسر امان اللہ اختر، پروفیسر فضل الرحمٰن، ڈاکٹر عبدالحکیم، جناب نیاز احمد ریٹائرڈ اے.ڈی.ایم.، پروفیسر اے.اے. ہلال، پروفیسر ایف.آئی. خان، پروفیسر نعمانی، ڈاکٹر قمر الحسن، سلطان احمد اور بدر عالم بدر جیسے نامورانِ شہر شامل تھے۔ (ڈاک سے)

بہار اردو اکادمی کے کمپیوٹر تربیتی مرکز کے فارغین کو تقسیم اسناد

● پٹنہ، 8 فروری۔ بہار اردو اکادمی میں کمپیوٹر تربیتی مرکز کے فارغین کو تقسیم اسناد کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے جناب رشید احمد خاں، سکریٹری محکمۂ اقلیتی فلاح نے کہا کہ اردو زبان کی تہذیب اور شائستگی کے سبھی قائل ہیں۔ اردو کمپیوٹر کورس کی تربیت کی فراہمی سے نوجوانوں کو روزگار کے مواقع حاصل ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اردو اکادمی کی کارکردگی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ بہار اردو اکادمی نے اردو کے تعاون سے چلائے جا رہے کمپیوٹر تربیتی کورس مکمل کرنے والے کامیاب طلبہ و طالبات کو اسناد تقسیم کیں۔ موصوف نے اپنے خطاب کے دوران کمپیوٹر کی اہمیت اور افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کمپیوٹر نے آج پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔ انھوں نے تمام طلبہ و طالبات کو تلقین کی کہ وہ جہاں بھی جائیں یہ عزم لے کر جائیں کہ اردو کے فروغ کے لیے ضرور کام کریں گے۔ اسناد حاصل کرنے والوں میں کئی غیر مسلم طلبہ و طالبات بھی شامل ہیں۔ ان میں دیپانکر بنرجی اور اپرنا آریہ قابل ذکر ہیں۔ سال 2005-06 بیچ میں اول مقام خالد قمر، دوئم ثمر نازش اور سوئم رفعت جہاں نے حاصل کیا۔ صدارتی تقریر میں جناب شفیع مشہدی نائب صدر بہار اردو اکادمی نے کورس کے بارے میں لوگوں کو بتایا اور یہ بھی کہا کہ اس کورس کا سرٹیفکیٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ڈوئک مشترکہ طور پر دیتی ہیں۔ اس موقع پر جناب عبدالواحد انصاری نائب صدر بہار اردو اکادمی بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر شکیب ایاز سنٹر انچارج و سکریٹری بہار اردو اکادمی نے مہمان خصوصی اور سامعین کا استقبال کیا۔ اور محمد جمال الدین اطہر نے مہمان خصوصی و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

بہار میں اردو زبان کو درپیش مسائل حل کرنے کی وزیر اعلیٰ کی یقین دہانی

● پٹنہ، 23 جنوری۔ انجمن ترقی اردو بہار کے ایک وفد نے بہار کے وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ وفد کی قیادت انجمن ترقی اردو بہار کے صدر پروفیسر ایم.او. صدیقی نے کی۔ وفد میں انجمن کے جنرل سکریٹری جناب فخر الدین عارفی اور سکریٹری ڈاکٹر نجیب اختر شامل تھے۔ انجمن کے وفد نے پوری تفصیل کے ساتھ بہار میں اردو زبان کو درپیش مسائل سے وزیر اعلیٰ کو واقف کرایا۔ وزیر اعلیٰ نے بڑی سنجیدگی اور نہایت دلچسپی کے ساتھ وفد کی تمام باتیں سنیں اور یہ یقین دلایا کہ وہ بلا تاخیر انجمن کے تمام مطالبات پر ضروری احکامات جاری کریں گے۔ انجمن کے وفد نے وزیر اعلیٰ کی خدمت میں جو میمورنڈم پیش کیا اس کے چند مطالبات اس طرح ہیں:

تمام سرکاری ہائی اسکول میں کم سے کم ایک اردو ٹیچر لازمی طور پر بحال کیا جائے اور اسکول میں اردو پڑھنے والے طلبہ کی قید کو ختم کیا جائے اس لیے کہ انجمن کا یہ ماننا ہے کہ جب ہر اسکول میں اردو ٹیچر کی بحالی عمل میں آ جائے گی تو اردو پڑھنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد میں خود بخود اضافہ ہوگا۔ انجمن نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے اساتذہ کی بحالی کا عمل شروع کرنے پر بھی زور دیا۔ انجمن نے راج بھاشا میں اردو مترجمین کی بحالیوں کا بھی پُرزور مطالبہ

کیا اور کہا کہ راج بھون اور وزیر اعلیٰ سکریٹریٹ میں اردو کا سیل کھولنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ بہار کی دوسری سرکاری زبان فروغ پا سکے۔ انجمن نے حکومت سے ریاست میں مزید 14 ہزار اردو اساتذہ کی بحالی کا بھی پُر زور مطالبہ کیا اور کہا کہ حالیہ بحالیوں میں اردو کے علاوہ دیگر مضامین میں مسلمانوں کی جو بحالیاں ہوئی ہیں ان کا شمار اردو کوٹے میں کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ وفد نے بہار کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ کی خالی یونٹوں پر بلا تاخیر اردو اساتذہ کی بحالی کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

وزیر اعلیٰ کے ساتھ انجمن کے وفد کی ملاقات بہت خوش گوار ماحول میں ہوئی اور امید ہے کہ جلد ہی سرکار تمام مطالبات پر کارروائی کرے گی۔

(ڈاک سے)

اردو کو زندہ رکھنا پوری قوم کا فرض۔ پروفیسر سیف الدین سوز

● نئی دہلی، 28/مارچ۔ اردو گنگا جمنی تہذیب کی نقیب اور علمبردار ہے، اسے کسی ایک قوم کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اردو کو زندہ رکھنا پوری قوم کا فرض ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج مرکزی وزیر برائے آبی وسائل پروفیسر سیف الدین سوز نے ایوان غالب میں اردو اکادمی دہلی کے سالانہ جلسۂ تقسیم ایوارڈ میں بطور مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے کیا۔

پروفیسر سیف الدین سوز نے کہا کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنا غلط ہے، بلکہ یہ ہندوستانی سماج کے بہت بڑے حصے کی زبان ہے اور اس کو زندہ رکھنا پوری قوم کا فرض ہے۔ اردو نے ملک کی جنگ آزادی میں انتہائی اہم رول ادا کیا اور لوگوں کے اندر انقلاب اور آزادی کی جدو جہد کا جذبہ بیدار کیا۔ اردو کے اندر لوگوں کو جوڑنے کی زبردست قوت ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ آج اردو کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور کچھ لوگ اسے مسلمانوں کی زبان کے طور پر مشہور کرنے لگے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ متعدد غیر مسلم ادبا شعرا اور دانشوروں نے اردو کی زلفیں سنواری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کے درمیان کے بہت کم فرق کو مہاتما گاندھی نے بھی محسوس کیا تھا اور انھوں نے خود اردو سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یو پی اے کی حکومت اردو کی بقا کے لیے سنجیدہ ہے اور اس کے لیے مزید اقدامات کیے جائیں گے۔

صدارتی تقریر میں آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین سید شاہد مہدی نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی ملک کی دوسری اردو اکادمیوں کے لیے رول ماڈل ہے جس نے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے بہترین خدمات انجام دی ہیں لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ سچر کمیٹی کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ سچر کمیٹی کی سفارشات کو اب طول دینے کی نہیں بلکہ ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

''تشخیص ہو چکی، نسخہ لکھا جا چکا اب دوائی ملنی چاہیے۔'' محض گفتگو کا سلسلہ اب ختم ہونا چاہیے اور اگلے پارلیمانی الیکشن سے قبل ٹھوس نتائج سامنے آنے چاہئیں۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے اکادمی کی طرف سے دیے جانے والے ایوارڈوں اور ایوارڈ یافتگان کے تعلق سے تفصیلات پیش کیں۔ آخر میں سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ اکادمی کے پی آر او انیس اعظمی نے تقریب کی نظامت کی۔ ڈائس پر موجود دیگر معزز مہمانان میں آندھرا پردیش اردو اکادمی کے وائس چیئرمین افضل الدین، اقبال مجید، مجتبیٰ حسین اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی بھی تھے۔ تقریب کے آغاز میں سدھانشو بہوگنا اینڈ پارٹی نے علامہ اقبال کا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا'' پیش کیا۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

بغداد سے شعبۂ عربی میں عراقی استاذ سردار محمد سعید کا توسیعی خطبہ

● نئی دہلی، 28/مارچ۔ عام بول چال کی زبان میں عام فہم زبان جیسا کچھ بھی قابل فہم ہو گوارہ کیا جاتا ہے، لیکن تحریری اور علمی ادبی زبان میں رائج عام لسانی غلطیوں سے زبان کی حفاظت لازم ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ بغداد یونیورسٹی کے فارغ التحصیل عراقی استاذ سردار محمد سعید نے اپنے توسیعی لیکچر کا آغاز کیا۔ انھوں نے کہا کہ عربی زبان مختلف بولیوں اور لہجوں کے اختلاف کے باوجود تحریری، علمی اور ادبی سطح پر ایک ہے جس کی جڑیں مضبوط، صرفی ونحوی قواعد اور قرآنی مفاہیم سے مربوط ہیں اور عرب ہر حال میں ان کی پابندی کرتے ہیں۔ موصوف نے عربی زبان سے بہت سی مثالیں پیش کیں اور صحیح و غلط کی نشاندہی کرتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے عربی داں زبان و بیان کی صحت پر خصوصی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔

صدر شعبۂ عربی پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی نے اپنے تعارفی و خیر مقدمی کلمات میں بغداد کے اہل علم اساتذہ اور بغداد کی تہذیبی، ثقافتی اور علمی، ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی اور جامعہ میں سردار محمد سعید کی آمد کو خوش آئند بتایا۔

توسیعی خطبے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کے اعزاز میں دیے گئے الوداعی جلسے کا سلسلہ شروع ہوا جو مختلف پروگراموں پر مبنی تھا اور دیر تک چلتا رہا۔ آخر میں سال بھر کی ادبی، ثقافتی سرگرمیوں اور انعامی مقابلوں کے نتیجے میں قابل قدر مقام حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات اور تمغوں سے نوازا گیا۔ تلاوت کلام پاک سے شروع ہونے والے اس جلسے کا اختتام بزم ادب عربی (النادی الادبی) کے مشیر ڈاکٹر عبدالماجد قاضی کے کلمات تشکر اور اس کے بعد پرتکلف عشائیہ پر ہوا۔ پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر رفیع العماد فینان، پروفیسر فرحانہ صدیقی، پروفیسر خالد حامدی، پروفیسر محمد ایوب تاج الدین، ڈاکٹر حبیب

اللہ خاں، ڈاکٹر فوزان احمد سمیت شعبۂ عربی کے بہت سے طلبہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر النادی الادبی کے نائب صدر عامر صفی الرحمٰن، جنرل سکریٹری ساجد حسین، سکریٹری اعجاز احمد، نائب سکریٹری، عزیز الرحمٰن، محمد اجمل فاروق اور سید محمد فیصل نے خصوصی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ (روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

اردو اور تصوف کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا

● نئی دہلی، 31/مارچ۔ اردو تصوف میں گلے گلے ڈوبی ہوئی ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اس خیال کا اظہار خواجہ حسن ثانی نظامی نے یہاں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام "اردو اور تصوف" کے موضوع پر اپنے خطبے کے دوران کیا۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ میں صوفیا کے رول پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے کہا کہ اردو صوفیا حضرات کے یہاں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ مہمان خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ اردو زبان ہی نہیں، بلکہ کسی بھی زبان کی بقا کی ضامن اس کی ترویج ہے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک میں چھوٹے کتب خانوں کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو اپنی ادبی وراثت کی بدولت ہمیشہ مقبول تھی، ہے اور رہے گی۔ آج مختلف ٹی وی چینلوں میں جس قدر اردو زبان کا استعمال ہو رہا ہے، وہ اس زبان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ انجمن ترقی اردو کے سربراہ خلیق انجم نے اس موقع پر انجمن کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ تقریب کے دوران لائبریری سائنس کے کامیاب طلبہ کو اسناد اور انعامات سے نوازا گیا۔ آخر میں قوالی کا بھی پروگرام ہوا۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ادب کی تخلیق پڑھانے کے لیے نہیں، پڑھنے کے لیے ہوتی ہے — جوگیندر پال

● علی گڑھ، 29/مارچ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام قومی مذاکرہ "ہم ادب کیوں پڑھتے ہیں" فیکلٹی آف آرٹس کے لاؤنج میں منعقد کیا گیا۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف فکشن رائٹر جوگندر پال نے کہا کہ ادب اپنے آپ میں ایک متوازی زندگی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو ٹھیک ہوگا کہ ادب پڑھنے کے لیے تخلیق ہوتا ہے نہ کہ پڑھانے کے لیے انھوں نے کہا کہ ادیب جو تخلیق کرتا ہے وہ قاری اپنے معیار اور مطلب کے ذریعے سمجھتا ہے۔ جوگندر پال نے کہا کہ کوئی کتاب محض کاغذ کے صفحات پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ قاری کے ذہن میں ختم ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم ذاتی مفادات کے لیے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں زیادہ کامیابی نہیں مل سکتی ہے کیونکہ ادب اپنے آپ کو سوچنے کا نام ہے۔ افتتاحی اجلاس میں مندوبین کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ ادب کا مطالعہ ہم اپنے آپ کو اور دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کرتے ہیں۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ موجودہ دور میں ادب کی شناخت کے حوالے سے قدم قدم پر سوالیہ نشان لگائے جا رہے ہیں۔ شعبۂ اردو میں سینئر استاذ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اپنا خصوصی مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب پڑھنے کا عمل اپنی شخصیت کی بازیافت کا عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا مطالعہ مخصوص نظریوں کی روشنی میں قطعی نہیں کرنا چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے عہدے پر فائز پروفیسر شمیم حنفی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب کا مطالعہ میں خود اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے کرتا ہوں۔ موجودہ حالات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ صارفیت نے ادب اور آرٹ پر سوالیہ نشان قائم کردیے ہیں جس کے پیش نظر ادب سے وابستگی خسارے کا سودا معلوم ہوتی ہے، لیکن ادب فہمی کے دروازے کسی پر مشکل سے کھلتے ہیں اور کسی پر کبھی نہیں کھلتے۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر کے ایم مشرا نے کہا کہ اگر ہم ادب نہ بھی پڑھیں تو دنیا چلتی رہے گی لیکن اس دنیا کو خوبصورت بنانے کے لیے ادب کا سہارا اہم ہوتا ہے۔ مذاکرے کی نظامت شعبۂ اردو کے سینئر استاد پروفیسر سید محمد ہاشم نے کی۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

پریم چند کی یاد

● بارہ بنکی۔ رضا کار تنظیم پریرنا ایکشن سوسائٹی (پاس) کے زیر اہتمام خمار اکادمی ہال میں "اردو کی اعلیٰ قدروں کے علمبردار: منشی پریم چند" کے عنوان سے منعقدہ سیمینار میں شبلی اکادمی اعظم گڑھ کے مولانا عمیر صدیق نے کہا کہ پریم چند اپنے دور کے حقائق کو سامنے رکھنے والے تخلیق کار تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں انسانی جذبات کو بے حد مؤثر طریقے سے پیش کیا ہے۔ عام رائے ہے کہ منشی پریم چند نے اپنے مقبول ترین ناول "گئودان" کا ایک بڑا حصہ بارہ بنکی ضلع کے قصبہ دریاباد میں راجہ رائے راجیشور بلی کی قربت میں رہ کر لکھا ہے۔

ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو اردو کی بنیاد قرار دیتے ہوئے مولانا عمیر صدیق نے منشی پریم چند کے بارے میں مسلم علما اور ادبا کی رائے پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے عظیم ادیب مولانا شبلی نعمانی کی نظر میں منشی پریم

چند اردو کے مایۂ ناز مصنف تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں منشی پریم چند ایک ایسے ادیب تھے جو گرد و پیش کی منظر کشی پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔ شرافت ان کی تحریر کی جان تھی اور سادگی ان کے قلم کا ایمان۔ شہروں کی عکاسی کئی ادبا نے اپنی تحریروں میں کی ہے لیکن کھیت کی مینڈ پر صرف پریم چند ہی چلے ہیں۔

سیمینار میں مقالے پڑھنے والوں میں جناب شکیل صدیقی اور ڈاکٹر شہناز احمد نے تفصیلی مقالے پڑھے۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر راجیش کمل نے کہا کہ منشی پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے مکمل مصنف تھے ان کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اپناپن ان کی زبان کی شناخت تھی۔ منشی جی کی تخلیقات کی گہرائیوں میں جائیں تو ہم ان کی سادہ اور آسان زبان میں ہندوستان کی سچی تصویر پائیں گے۔ ڈاکٹر فدا حسین نے کہا کہ موجودہ نسل نے منشی پریم چند کو عام طور پر ہندی میں پڑھا ہے لیکن ان کی پہلی زبان اردو تھی۔

آخر میں پریرنا ایکشن سوسائٹی (پاس) کے ڈائریکٹر جناب محمد سلیم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار میں ڈاکٹر بھگوان وتس، ڈاکٹر شردھا سنگھ، ڈاکٹر وریندر پرتاپ، جلیل یار خاں وارثی، بابو لال ورما، کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات اور معزز خواتین و حضرات موجود تھے۔ (ڈاک سے)

مولانا عبدالماجد دریابادی پر سیمینار

● بارہ بنکی کی مقامی تنظیم رابطہ سیوا اسنستھان نے ہوٹل ریزیڈینسی میں مولانا عبدالماجد دریابادی پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا جس میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی نے کہا کہ آج کی مسلم نسل کا رشتہ ان کے بزرگوں اور دانشوروں کی قائم کردہ اعلیٰ قدروں سے ٹوٹ چکا ہے۔ ان کی تاریخ سے لاعلمی کا سبب ہے کہ ان پر عائد کیے جانے والے الزامات کو وہ قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عثمانی نے مزید کہا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو ملت کے نوجوانوں کی اس لاعلمی سے انتہائی تکلیف تھی۔ مسلمانوں کے حالات تب تک نہیں سدھریں گے جب تک وہ اپنے بزرگوں کی وراثت کی ناقدری کریں گے۔ آج نئی نسل کو اپنے ماضی کی مکمل معلومات کی ضرورت ہے۔ شبلی اکادمی اعظم گڑھ کے مولانا عمیر صدیقی نے اپنے مقالے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی انشا پردازی کے بہترین نمونے پیش کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کو غیر معمولی انشا پرداز قرار دیا۔

سیمینار کا آغاز قاری عبدالحمید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ رہبر تابانی دریابادی نے چار قطعات اور ایک نظم کے ذریعے مولانا عبدالماجد دریابادی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب سلمان علی خان کا مقالہ بعنوان "مولانا عبدالماجد دریابادی رفیق خاص— مولانا محمد علی جوہر" ڈاکٹر تسخیر الحسن نے پڑھا۔

مولانا نذر الحفیظ صاحب، پروفیسر محمد سلیم قدوائی، جناب خورشید کامل قدوائی اور جناب جلیل یار خان وارثی نے بھی خطاب کیا۔

سیمینار میں شرکا کے تئیں اظہار تشکر کرتے ہوئے رابطہ سیوا اسنستھان کے منیجر جناب محمد سلیم نے اعلان کیا کہ آئندہ سال تنظیم اپنے بہی خواہوں کے ساتھ مل کر مولانا دریابادی کے وطن عزیز دریاباد میں مولانا کی یاد میں پروگرام کرے گی۔ سیمینار میں ممتاز جیلانی، جنید شمس دریابادی، سید معراج احمد، حشمت اللہ، رضوان مصطفےٰ، حفیظ بھارتی، ڈاکٹر وریندر پرتاپ، طارق حبیب، خالدہ حبیب، زینت افروز، راجیش کمار چورسیا، ٹی. کے. رائے، ارون موریا، ذبیح اللہ انصاری و معزز خواتین و حضرات موجود تھے۔ (ڈاک سے)

پونے میں جشن اطفال کا انعقاد

● حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، مہاراشٹر کاسموپولیٹن سوسائٹی، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، مہاراشٹر میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر، گولڈن جوبلی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اردو پونے کے اشتراک سے اعظم کیمپس میں دوروزہ جشن اطفال 3 اور 4 فروری 2007 کو منعقد ہوا۔ نمائش کتب، فی البدیہہ تقاریر، خطاطی، بیت بازی، فینسی ڈریس اور ثقافتی پروگرام پر مشتمل اس دوروزہ پروگرام کا افتتاح مہمان خصوصی سرجن لیفٹیننٹ کمانڈر وحیدہ پرزم کے ہاتھوں پرچم کشائی سے ہوا۔ پرچم اردو کے لہراتے ہی تالیوں کی گونج میں غباروں اور کبوتروں نے فضا میں اڑان بھری۔ ملک سے مدعو ادب اطفال کے نمائندہ قلمکاروں، مہمانان اور اردو مدارس کے تقریباً دو ہزار طلبہ کی موجودگی میں ننھے منے بچوں نے مارچ کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی کو سلامی پیش کی۔

تلاوت کلام پاک کے ساتھ جناب منور پیر بھائی کے استقبالیہ کلمات سے تقریب کا آغاز ہوا۔ آپ نے کہا کہ اس پروگرام کے انعقاد کا مقصد عوام میں ادب اطفال کے تعلق سے بیداری پیدا کرنا ہے۔ قاضی مشتاق نے ادب اطفال کے تقاضوں پر روشنی ڈالی۔ محترمہ ممتاز پیر بھائی نے وحیدہ پرزم کا تعارف پیش کرتے ہوئے کشمیر کے ناگفتہ بہ حالات میں اپنے والد کو شہید کر دیے جانے کے بعد میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ان کے عزم و استقلال کو سراہا۔ سرجن کمانڈر محترمہ وحیدہ پرزم نے اپنی جوابی تقریر میں اپنے بچپن کو جذباتی انداز میں یاد کرتے ہوئے بچوں سے خطاب کیا۔ انھوں نے بچوں کو ہندوستان کے روشن مستقبل سے تعبیر کرتے ہوئے انھیں حوصلہ مندی اور استقلال کے ساتھ آگے بڑھنے اور اپنی قوم کا نام دنیا بھر میں روشن کرنے کی تلقین کی۔

پروگرام کے پہلے دور کا آغاز قاضی مشتاق احمد کی صدارت میں ہوا جس میں محمد خلیل، ڈاکٹر محبوب راہی، خیال انصاری، عبدالرحیم نشتر، رشید قاسمی، ایم. مبین اور نذیر فتحپوری نے حصہ لیا اور ''21 ویں صدی میں ادب اطفال کے تقاضے'' کے موضوع پر سامعین سے براہ راست گفتگو کی۔

دوسرے دن ''ادب اطفال میں ادبا کا کردار'' کے عنوان پر محترمہ ممتاز پیر بھائی کی زیر صدارت ادبی نشست میں سینئر اردو ڈی.ایڈ کالج کے طلبہ و طالبات نے براہ راست عبدالاحد ساز، بانو سرتاج، وکیل نجیب، حیدر بیابانی، آفتاب حسنین، ڈاکٹر ایم.آئی.ساجد، ایم.رفیق اور رحمان سلیم سے بات چیت کی، کئی سوالات پوچھے اور مہمان ادبا نے ان کے تسلی بخش جوابات دیے۔ اس موقع پر کئی کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا اختتامی جلسے کی مہمان خصوصی عابدہ انعامدار نے طلبہ و طالبات اور اساتذہ کو دور حاضر میں جدید ٹیکنالوجی کی روشنی میں تعلیمی سفر طے کرنے اور کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار ہونے کے مشورے دیے۔ پروفیسر عظمیٰ تسنیم کے شکریے پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

تفہیم شعر کی کلاس

● علی گڑھ، 5 فروری۔ ذوق مطالعہ کے فقدان نے حصول علوم میں دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ رجحان عمومی ہے۔ اس میں اہل علم و فن، شاعر، ادیب، استاد، شاگرد اور ایک عام آدمی کی کوئی تخصیص نہیں۔ خصوصاً شاعری کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیت میں خاصی کمی واقع ہو چکی ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر سرسید اردو گرلس ہائی اسکول اور جونیئر کالج کے زیر اہتمام اساتذہ، شعرا اور اہل ذوق کے لیے 3، 4 و 5 فروری کو تفہیم شعر کی سہ روزہ کلاس منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر الیاس صدیقی صاحب مالیگانوی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کلاس کی رہنمائی فرمائی اور حاضرین کو نہ صرف فن شاعری کی مبادیات سے آگاہ کیا بلکہ الفاظ، تشبیہات، استعاروں اور علامتوں کے تلازموں اور مجازی معنی سے روشناس کرواتے ہوئے الفاظ کے پردے کے پیچھے موجود وسیع جہان معنی تک رسائی کے طریقے بھی بتائے۔ چالیس سے زائد احباب نے کلاس سے استفادہ کیا۔

اس کلاس کو کامیاب بنانے کے لیے اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر شاہ خلیل احمد، معاون مدرس ڈاکٹر شجاعت علی قادری اور جملہ اسٹاف نے محنت کی۔

(ڈاک سے)

ابن صفی پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 16 مارچ۔ نام نہاد سنجیدہ ادب کے سامنے ابن صفی کی تخلیقات پر توجہ نہیں دی گئی۔ ابن صفی کے یہاں جو کردار ہیں ان کا طرز زندگی تو مغربی ہے لیکن ان کے اوصاف مشرقی ہیں اور اس کی مثال ''فریدی'' اور ''عمران'' جو عورتوں کی جانب نگاہ بد نہیں ڈالتے۔ ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام ''ابن صفی کے ناولوں پر ایک گفتگو'' کے عنوان سے منعقد مذاکرے میں یوروپ میں اردو کی معروف اسکالر اور انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز ہائیڈلبرگ جرمنی میں سینئر لیکچرر ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے اپنا خصوصی مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے کہا کہ سنجیدہ ادب میں جاسوسی یا تفریحی ادب کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی جو مناسب نہیں ہے۔ تفریحی ادب میں تجسس اور جاذبیت پیدا کی جاتی ہے اور تمام سوالوں کے جواب دے کر آخر میں قاری کو مطمئن کر دیا جاتا ہے جبکہ نام نہاد سنجیدہ ادب میں بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی حل پیش نہیں کیا جاتا۔ انھوں نے کہا کہ ابن صفی کی تخلیقات کو اب تک ادب کے حوالے سے نظر انداز کیا گیا ہے ہمیں اس رویہ کو تبدیل کرنا ہوگا۔

اس سے قبل ڈاکٹر کرسٹینا کا استقبال کرتے ہوئے ساہتیہ اکیڈمی کے صدر اور معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی اردو کے لیے خدمات کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے ان کے نمایاں کاموں کا ذکر کیا اور کہا کہ ڈاکٹر کرسٹینا نے جرمن میں اردو ادب و تاریخ کا درس دینے کے ساتھ ساتھ اردو کے بہت سے افسانوں اور ناولوں کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ ابن صفی کے تعلق سے بات کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ سوال یہ ہے کہ جاسوسی اور تفریحی ادب، ادب کا حصہ ہے یا نہیں؟ اگر ادب کا حصہ نہیں ہے تو ہم جاسوسی کے ساتھ لفظ ''ادب'' کیوں لگاتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ابن صفی نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی ہے۔ ابن صفی کو اردو والوں نے ہی نہیں، بلکہ دیوناگری والوں نے بھی کافی پڑھا ہے۔ ابن صفی کی مقبولیت اور شہرت سرحدوں میں قید نہیں ہے اس لیے انھیں نظر انداز کرنے کے بجائے ہمیں ادب میں معیار بندی کے اپنے رویے کو تبدیل کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر کرسٹینا کے مقالے کے بعد بحث میں حصہ لیتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ابن صفی کے ناولوں میں زبان، بیان اور پلاٹ بھی ہے اور تیسری دنیا کا شعور بھی۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں ہی ان باتوں کی نشاندہی کر دی تھی جو آج سامنے آ رہی ہیں۔ بحث میں ان کے علاوہ پاپولر ادب کے معروف قلم کار اظہار اثر، سید محمد اشرف، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر صادق وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ اہم شرکا میں پروفیسر اسرائیل رضا، محمد عارف اقبال، ڈاکٹر شبانہ

نذیر، ابوبکر عباد، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر ارجمند آرا، یونس دہلوی، ظہیر احمد برنی، ڈاکٹر مولا بخش، کفایت دہلوی، ڈاکٹر شہزاد انجم، سیماب سلطان پوری، شین کاف نظام، معین شاداب، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، شائق ساکھنوی وغیرہ موجود تھے۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● بھوبنیشور، 24 جنوری۔ اڑیسہ اردو سرکل اور اڑیسہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام ریڈ کراس بھون میں ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اڑیسہ آمد پر ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت شعبۂ تہذیب وثقافت، اڑیسہ سرکار کے سکریٹری شری گوپی ناتھ نے کی۔ اڑیسہ اردو اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر لیاقت علی اور اردو سرکل کے صدر سید مجیب الرحمٰن میکش کے تعارفی خطبات کے بعد دو سپاس نامے پڑھ کر سنائے گئے۔ بعد ازاں انجمن ترقی اردو، اڑیسہ، اردو سرکل، اڑیسہ، اردو اکادمی اور فیضانِ ادب، کٹک جیسے اداروں نے پروفیسر موصوف کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے۔ اس تقریب میں پروفیسر کرامت علی کرامت کی دوسری شعری تصنیف ''شاخِ صنوبر'' اور بچوں کے رسالے ''جگنو'' کی رسمِ اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں انجام پائی۔ اردو سرکل کی جانب سے اردو کے شاعر سہیل اختر کو مہمانِ خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے دستِ مبارک سے سپاس نامہ پیش کیا گیا، جس کے متن کی قرأت سمن نسیمی نے کی۔۔۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خطاب میں اردو کی تہذیب وتاریخ پر روشنی ڈالی۔ اس استقبالیہ تقریب کے آخر میں پروفیسر کرامت علی کرامت، خالد رحیم، عبدالمتین جامی، عبدالحق چناب، سہیل اختر، نورالہٰی ناطق، خاور نقیب، عبدالحفیظ بسمل، شمس الحق شمس، سمن نسیمی، سعید احسن، قطب کامران، قدرت علی قدرت، توفیق ساگر، مجیب الرحمٰن میکش، شوکت رشیدی اور مجیب پرواز نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

اردو سرکل کے سکریٹری سید برکت علی تنویر کے کلماتِ تشکر کے ساتھ یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

(ڈاک سے)

● بھوپال، 7 مارچ۔ اردو اکادمی کی طرف سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی. ٹی. پی. کے گذشتہ سالوں کے امتحانات میں کامیاب طلبہ کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے کانفرنس ہال میں منعقدہ ایک پروگرام میں جناب منوج شریواستو، سکریٹری، پبلیسٹی اور کلچرل ڈپارٹمنٹ، حکومت مدھیہ پردیش کے ہاتھوں سرٹیفکیٹ تقسیم کیے گئے۔ اس موقع پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر بشیر بدر اور اکادمی کی سکریٹری محترمہ نصرت مہدی نے طلبہ وطالبات کے روشن مستقبل پر روشنی ڈالی اور انھیں ملکی خدمات نمایاں طور پر انجام دینے کی تلقین کی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل اور DOEACC وزارت انفارمیشن ٹیکنالوجی، حکومت ہند کے ذریعے متحدہ طور پر سرٹیفکیٹ تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر جناب اقبال مسعود، جوائنٹ سکریٹری، جناب حسن مصطفیٰ سینئر سپروائزر اور جناب اعظم حسین، دلشاد حسین استاد کمپیوٹر سینٹر اور بڑی تعداد میں طلبہ وذمہ داران موجود تھے۔

(ڈاک سے)

● دہلی، 21 مارچ۔ ادبی تنظیم ''سب رنگ'' کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی میں چار کتابوں پروفیسر حفیظ بنارسی کی ''سفیرِ شہرِ دل'' (کلیات)، ڈاکٹر زرینہ رحمٰن کی ''حفیظ جالندھری کا فن'' اور ڈاکٹر عبیدالرحمٰن کی ''سوچ آبشار'' اور ''سائنس سب کے لیے'' کا اجرا کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کی اور نظامت کے فرائض ابرار رحمانی نے انجام دیے۔ اس موقع پر قاضی ابرار کرت پوری، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مولا بخش، شعیب رضا فاطمی، افروز عالم اور احمد علی برقی نے مقالے پڑھے۔ پروفیسر قمر رئیس نے حفیظ بنارسی کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا حفیظ بنارسی کی شاعری میں خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ مظہر امام نے ''کلیاتِ حفیظ بنارسی'' کا اجرا کیا اور کہا کہ یہ غزلیہ شاعری کا عمدہ نمونہ ہے جو فنی خامیوں سے پاک ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے عبید الرحمٰن کی شاعری کے متعلق کہا کہ انھیں شعری لفظیات کا احساس ہے۔ ان کے یہاں تخیل کی کارفرمائی اور ایجاد کاری کا حسن نمایاں ہے۔ پروفیسر شفیق اللہ نے ''سوچ آبشار'' کا اجرا کیا اور کہا کہ عبید الرحمٰن کو عصری مسائل کا خوب اندازہ ہے۔ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی نے ''سائنس سب کے لیے'' کا اجرا کیا اور اس کتاب کو وقت کی ضرورت قرار دیا۔ پروفیسر اختر الواسع کے ہاتھوں ''حفیظ جالندھری کا فن'' کا اجرا ہوا۔ انھوں نے اس کتاب کو حفیظ شناسی کی سمت میں اہم پیش رفت سے تعبیر کیا۔ اس موقع پر پروفیسر گوپی چند نارنگ، صدر ساہتیہ اکادمی کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ جلسے میں جناب یٰسین عثمانی، چیئرمین اتر پردیش اردو اکادمی بھی موجود تھے۔

تقریب اجرا کے بعد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔ جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان کے نام ہیں: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، حفیظ بنارسی، مظہر امام، شہپر رسول، ابرار کرت پوری، سہیل احمد فاروقی، ماجد دیوبندی، اقبال اشہر، اسرار جامعی، فصیح اکمل، معین شاداب، شین امروہوی، رؤف رامش، کوثر مظہری، مولا بخش، عازم کوہلی، عادل حیات، عبید الرحمٰن، عبدالقادر، افروز عالم

(کویت)، مشتاق صدف، عرفان احمد، کمال جعفری اور عمیر منظر۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 23 مارچ۔ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ممتاز افسانہ نگار بلراج ورما کے اعزاز میں غالب اکیڈمی میں آج ''بلراج ورما کے ساتھ ایک شام'' کے عنوان سے پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت جوگندر پال نے کی جبکہ اردو اکادمی کے سابق سکریٹری پروفیسر صادق نے بطور مہمان ذی وقار پروگرام میں شرکت کی۔ نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے انجام دیے۔ اس موقع پر اردو اور ہندی ادب کی متعدد معزز شخصیات موجود تھیں۔

اس موقع پر مشہور ادیب و شاعر مظہر امام نے کہا کہ بلراج ورما اردو ادب کی ممتاز شخصیت ہیں لیکن انھیں اردو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ انھوں نے اس موقع پر اردو اکادمی سے ایسے ادیبوں کو مزید بڑے اعزاز سے نوازنے کی اپیل بھی کی۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ بلراج ورما ناول نگار، افسانہ نگار، ترجمہ نگار اور مدیر ''تناظر'' کی حیثیت سے اہم مقام کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے بلراج ورما کی سوانح اور شخصیت پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو بلراج کی نہ مادری زبان ہے نہ دفتری اور نہ ہی نصابی لیکن پھر بھی انھوں نے اردو کو اپنے دوسرے عشق کا درجہ دیا۔ پروگرام میں مرغوب حیدر عابدی نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے بلراج ورما کی درازی عمر کی دعا کی۔ پروگرام میں بلراج ورما کی اہلیہ کملی ورما نے بھی بلراج ورما کے ساتھ گزاری ہوئی اپنی زندگی پر اپنی ایک نظم پیش کی۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 22 مارچ۔ اردو اور پنجابی زبانوں کو فروغ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ راجدھانی کے تمام اسکولوں میں کم سے کم پانچویں جماعت تک ان دونوں زبانوں کو بطور مضمون پڑھایا جائے۔ اس کے علاوہ تمام اسکولوں میں بھی اردو اور پنجابی کے اساتذہ مقرر کیے جانے چاہئیں تب ہی ان دونوں زبانوں کی ترویج و ترقی کی راہ ہموار ہو سکے گی۔ ان خیالات کا اظہار آج این ڈی ایم سی کی وائس چیئر پرسن اور ممبر اسمبلی تاجدار بابر نے راجندر بھون میں اردو اور پنجابی کے فروغ کے لیے انٹرنیشنل مائنارٹیز ہوئیرنیس مشن اور اردو سبجیکٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے اشتراک سے منعقد سیمینار کے دوران کیا۔

تاجدار بابر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو اور پنجابی کو تب ہی فروغ حاصل ہوگا جب ہماری نئی نسل ان زبانوں کو پڑھے گی اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ دہلی سرکار، این. ڈی. ایم. سی.، ایم. سی. ڈی.، دہلی کنٹونمنٹ اور نویگ اسکولوں میں بھی کم سے کم پانچویں جماعت تک ان دونوں زبانوں کو بطور مضمون پڑھایا جائے۔ اور اردو، پنجابی کے ٹیچر مقرر کیے جائیں۔

اپنی زبانوں کا تحفظ کرنا ہماری اپنی بھی ذمہ داری ہے۔ سب کچھ سرکار پر چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے۔ انھوں نے ماہرین تعلیم سے اپیل کی کہ وہ اردو اسکولوں کے لیے معیاری اور بہترین نصاب تیار کریں۔ انھوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ اردو ٹیچروں کے پاس پڑھانے کے لیے اردو کی کتابیں تک نہیں ہوتیں۔

پروفیسر صلاح الدین نے اس بات کا شکوہ کیا کہ سرکار نے ہمیں جتنے بھی اردو کے پلیٹ فارم مہیا کرائے ہیں ان پر کروڑوں روپئے خرچ ہو رہے ہیں لیکن ان کے ذریعے محض کاسمیٹک سروس ہو رہی ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اس میں دکھاوا زیادہ ہے۔ اردو کے تعلق سے صرف وعدے کیے جاتے ہیں جو کبھی پورے نہیں ہوتے، اعلانات پر عمل نہیں ہوتا۔ صورت حال یہ ہے کہ اسکولوں میں پڑھانے کے لیے اردو کے اساتذہ نہیں ہیں۔ اردو اکادمی کے ذریعے اردو اساتذہ نہیں ہیں۔ اردو اکادمی کے ذریعے اردو اساتذہ سے انتہائی کم اجرت پر کام لیا جا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کو برباد کیا جا رہا ہے۔ کے. کے. گاندھی نے کہا کہ اگر اردو اور پنجابی کو فروغ دینا ہے تو حکومت ہر اسکول میں کم سے کم ایک ایک اردو اور پنجابی ٹیچر مقرر کرے۔ اسکولوں سے لے کر کالجوں تک اردو اور پنجابی کی کلاسیں قائم ہوں۔ انیس درانی نے کہا کہ اردو کے تعلق سے ہم اردو والوں کو بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے ضرور دلائیں۔ اس سے نئی نسل اردو سے واقف بھی ہوگی اور جب اردو کے طلبہ ہوں گے تو اردو اساتذہ کے لیے بھی جگہ بنے گی۔

ان کے علاوہ ڈائرکٹر ایجوکیشن این. ڈی. ایم. سی ممتا کوچر، عظیم اختر، پروفیسر ذاکر علی، ڈاکٹر نجمہ صدیقی، نظام الٰہی، ڈاکٹر نسیم صدیقی، ڈاکٹر شبانہ نذیر وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس سے قبل مولانا شمس الحق کی تلاوت کلام پاک سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ نورالدین نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے اور چودھری عباس علی نے اظہار تشکر کیا۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

● نئی دہلی، 27 مارچ۔ اردو پریس کلب کے زیر اہتمام نہرو ہاؤس، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک ادبی مذاکرے اور بزم شعر کا انعقاد عمل میں آیا، جس کی صدارت عبدالرشید شاہین ممبر راجیہ سبھا اور چیئرمین اردو پریس کلب نے کی اور نظامت کے فرائض مشہور شاعر فصیح اکمل نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی میں کانپور سے تشریف لائے جناب عمر فاروق پدم شری بیکل اتساہی، شکیل الزماں انصاری، پیغام آفاقی، ڈی آئی جی کیول سنگھ، منصور عثمانی، عظیم اختر، ڈاکٹر صلاح الدین خان، ڈاکٹر عشرت جہاں قاسمی، مشتاق احمد ایڈووکیٹ، ساجد احمد خان، محترمہ نگار عظیم، محترمہ وسیم راشد اور محترمہ یمن خان نے اپنی شرکت سے رونق میں اضافہ کیا۔ پروگرام کے آغاز میں فصیح اکمل نے اردو

پریس کلب کے قیام اور اس کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو پریس کلب ایک سرگرم ادارہ ہے جو ادبی وسیاسی موضوعات پر منفرد نوعیت کے پروگرام منعقد کرتا رہا ہے۔ اس کے بعد اردو آفیسر حکومت دہلی ڈاکٹر اشفاق عارفی نے اپنے مقالہ ''نئی آوازوں کی شناخت'' کے مسئلے پر شعری حوالے سے بے حد سیر حاصل باتیں کیں۔ اس مقالے کے بعد سید تصنیف حیدر نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ **(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

● جودھپور، مشہور شاعر مخمور سعیدی کو ساہتیہ اکادمی، دہلی کا انعام ملنے کی خوشی میں شہر کی ادبی تنظیموں بزمِ اردو، بزمِ تعمیر اردو، امکانِ ادب اور سروکار کی جانب سے ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جے نرائن ویاس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر لوکیش کمار شیکھاوت نے کی۔ مہمان خصوصی راجستھان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مکھر اج کلا تھے۔ اس موقعے پر معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے کہا کہ مخمور سعیدی اچھے اور سچے شاعر ہیں۔ شاید اسی لیے وہ غیر مشروط ذہن اور جذبے کے مالک ہیں۔ ان کا اعزاز اردو کے شعری ادب کا اعزاز ہے۔ وائس چانسلر سے جے نرائن ویاس یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی کلاسیز شروع کروانے کا مطالبہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سابق وائس چانسلر نے ہم لوگوں کی گزارش قبول کرتے ہوئے یونیورسٹی میں اردو کلاسیز کا آغاز کردیا۔ اب آپ سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ ایم اے اردو کی کلاسیز بھی شروع کی جائیں۔ نظام صاحب کے مطالبے کے جواب میں ڈاکٹر لوکیش کمار شیکھاوت نے اپنی تقریر میں کہا کہ میری ذاتی کوشش رہے گی کہ آنے والے سیشن سے ہماری یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی کلاسیز شروع ہوجائیں۔

مہمان خصوصی مکھر اج کلا نے مخمور سعیدی کی جودھپور سے بے پناہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مخمور سعیدی کا اعزاز جودھپور کا اعزاز ہے۔ ڈاکٹر نثار راہی نے کہا کہ مخمور کی غزل کی لفظیات سادہ اور اکہری نہیں ہے اور ان کا لفظوں کو برتنے کا فن ہمیں اساتذہ کی یاد دلاتا ہے۔ اشراق الاسلام ماہر نے کہا کہ مخمور سعیدی کی شاعری ایک حساس شخصیت کی فکر و تخیلات کا امتزاج ہے اور انھوں نے عصری آگہی کو اپنی شخصیت کے ساتھ جانچا پرکھا، دیکھا اور برتا ہے۔ مہمان خصوصی کلا صاحب نے عمامہ اور شال اوڑھا کر اور صدر شیکھاوت نے مومنٹو اور سری پھل کے ذریعے مخمور سعیدی کا استقبال کیا۔ مخمور سعیدی نے تمام تنظیموں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

سوچنا کیندر آڈیٹوریم میں منعقد اس یادگار تقریب میں شہر کے ادیبوں، شاعروں اور معزز افراد نے شرکت کی۔ راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے ڈی راہی نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض محمد افضل جودھپوری نے انجام دیے۔ **(ڈاک سے)**

● نئی دہلی، 31 مارچ۔ جواہر لال نہرو اسٹڈیز سینٹر کے آؤٹ ریچ پروگرام کے تحت ایڈورڈ سعید ہال میں مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ ابتدا میں پروفیسر اختر الواسع نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور ان کے فن پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجتبیٰ حسین نے ہنسی کو ایک فریضے کے طور پر انجام دیا ہے۔ وہ صرف قہقہہ لگانے کے لیے نہیں لکھتے بلکہ اس کے پس پردہ زندگی اور اس کے مسائل کا کرب بھی ہوتا ہے۔

ان کی تخلیقات کے حوالے سے انھوں نے مجتبیٰ حسین کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ زبان کو اس خوبی سے برتتے ہیں کہ مزاح کا پہلو خود بخود اجاگر ہوجاتا ہے۔ انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ رشید احمد صدیقی کے علی گڑھ کی طرح مجتبیٰ حسین کے یہاں ہمیں حیدرآباد کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

اس موقع پر مجتبیٰ حسین نے 'نثری سے پدم شری تک اور حیدرآباد کا ذکر' اپنی مزاحیہ تخلیقات میں پیش کیں۔ جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ مجتبیٰ حسین سے ان کے فن اور اس کے متعلقات پر سوالات بھی کیے گئے جن کا انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ جلسے کی نظامت رخشندہ جلیل نے کی۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● گیا، یکم اپریل۔ رشید احمد خاں نے (سکریٹری محکمۂ اقلیتی فلاح و بہبود حکومت بہار) گیا شہر میں مولانا انوار الحق لائبریری کی افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مولانا انوار الحق لائبریری کا قیام ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائرکٹر خدابخش لائبریری کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ آغاز شکیل علائی کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ نظامت ڈاکٹر شاہد رضوی نے کی جبکہ صدارت ڈاکٹر شکیل احمد سابق پرنسپل مرزا غالب کالج گیا نے کی۔ لائبریری کے نگراں ڈاکٹر حسین الحق نے لائبریری کے سلسلے میں تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے ماہ ربیع الاول کے خیال سے بہ عنوان ''محمد بحیثیت معلم'' تقریر کی۔ رشید احمد خاں نے لائبریری کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مختلف منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے اعلیٰ تعلیم، مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے کوچنگ کا نظم وغیرہ کا ذکر کیا۔ معاون خصوصی نہال الدین نے کہا کہ گیا کی تاریخی لائبریری کی تاریخ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے قبل شہر میں دو اور لائبریریاں بھی تھیں۔ ایک اختر لائبریری جامع مسجد اور ایک اردو لائبریری کٹھوکر تالاب لیکن وہ ان دنوں ختم ہوچکی ہیں۔ ڈاکٹر امتیاز نے افتتاحی خطاب میں کہا کہ لائبریری کا کلچر ان دنوں بالکل ختم ہوچکا ہے۔ لائبریری کا کام صرف کتابیں رکھنا نہیں بلکہ اس کے ذریعے کتابوں کی ترویج و اشاعت بھی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ عابد رضا بیدار کے زمانے سے خدابخش لائبریری میں اس عمل کو شروع کیا گیا جو ہنوز جاری ہے۔ انھوں نے مولانا انوار الحق لائبریری کو تحفتاً تین کتابیں دیں۔ **(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

● علی گڑھ، 26 / مارچ۔ حکومت ہند کے قومی مخطوطات مشن نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کو مخطوطات حفاظتی معاون سینٹر (ایم سی پی سی) قرار دیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لائبریرین شکیل احمد نے اس سلسلے میں بتایا کہ قومی مخطوطات مشن ملک کے بکھرے اور ضائع ہوتے مخطوطات کے اثاثے کو بچانے اور مخطوطات کے تحفظ کے لیے کام کر رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا آزاد لائبریری میں اردو، عربی، فارسی، ہندی، تیلگو اور ملیالم زبان کے 14 ہزار 575 نادر مخطوطات موجود ہیں جن میں اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی کا خط، کوفی میں ہاتھ سے لکھا قرآن شریف کا نسخہ، شریف الرازی کا ایڈٹ کیا، نہج البلاغہ، کا نسخہ، ولی اللہ فرنگی محلی کی قرآن کریم کی تفسیر، اکبر کے نورتنوں میں شامل ابوالفضل اور فیضی کی مہاپران، بھگوت گیتا، مہابھارت اور لیلاوتی کا فارسی زبان میں ترجمہ، چاول کے دانے پر سورۃ اخلاص، چاول کے ایک دیگر دانے پر سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ضیا الدین کی تصویر و نام، مغلیہ عہد کا کرتے پر لکھا مکمل قرآن اور اورنگ زیب کا تحریر کردہ قرآن کریم کا نسخہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعرے

● بزم علم وادب کی جانب سے 24 جنوری 2007 کی شب نو بجے شہر بھیونڈی کے اردو اسکولوں کے اساتذہ اور سرپرستوں کے نمائندوں پر مشتمل ''تمثیلی مشاعرہ'' منعقد کیا گیا۔ تمثیلی صدارت مرزا اسد اللہ خاں غالب کو تفویض کی گئی تھی۔ مرزا صاحب جب محفل میں تشریف لائے تو حاضرین نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ محفل شعر میں مرزا صاحب کے لیے حقہ بھی موجود تھا اور حقے کو تازہ دم رکھنے کے لیے ان کا باوفا خدمت گار بھی۔

تمثیلی مشاعرے میں خمار بارہ بنکوی، دل لکھنوی، ساغر اعظمی، وسیم بریلوی، قیصر الجعفری، حق کانپوری، اعجاز رحمانی، نواز دیوبندی، ماجد دیوبندی، منظر بھوپالی، نعیم اختر خادمی، نور اندوری، اقبال اشعر، مختار یوسفی اور بدرالدین بادل کے کلام کو انھی کے انداز و ادا میں پیش کیا گیا۔ تمثیلی شعرا نے صوری و معنوی اعتبار سے اپنی پیش کش کو حقیقت سے بہت قریب کر دیا تھا جس کی ہال میں موجود ہزاروں باذوق سامعین نے بھرپور داد دی۔

اس محفل شعر میں بہترین مظاہرے پر تمثیلی شعرا کو انعامات سے بھی نوازا گیا۔ جناب اعجاز نبی کاریگر (شولاپور) اور جناب امیر حمزہ ثاقب نے جج کا فریضہ انجام دیا۔ جناب اعجاز نبی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بزم علم وادب کو اس پیش کش پر مبارکباد دیتے ہوئے اپنی تہذیب وثقافت کو فروغ دینے اور اردو کو مقبولیت عطا کرنے کے لیے حقیقی مشاعروں کے انعقاد کی ضرورت پر زور دیا۔ سکریٹری بزم علم وادب جناب عبدالعزیز انصاری نے تقریب کے خصوصی مہمان ڈاکٹر مصدق پٹیل اور اعزازی مہمانان جناب پرویز سردار، جناب شان رب، الحاج نعمان خاں، جناب محمد علی خاں اور جناب عبدالرزاق رند (شولاپور) کا استقبال کیا۔ جناب عامر صدیقی نے بزم کی سرگرمیوں کی روداد سنائی اور جناب ساجد انور نے تمثیلی مشاعرے کے اصول و ضوابط سے سامعین کو واقف کرایا۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق اول انعام کا مستحق جناب اعجاز مومن کو نور اندوری کی بہترین تمثیل پیش کرنے پر دیا گیا۔ دوم انعام سے جناب محمد رفیع انصاری کو نوازا گیا آپ نے اقبال اشعر کی تمثیل پیش کی۔ جناب نظام الدین کو مزاح گو شاعر مختار یوسفی کی تمثیل پیش کرنے پر سوم انعام دیا گیا۔ چہارم انعام کے مستحق جناب مدثر شیخ قرار پائے آپ نے ڈاکٹر وسیم بریلوی کا کردار ادا کیا۔ پنجم انعام سے جناب سیماب انوار کو نوازا گیا۔ آپ نے خمار بارہ بنکوی کی تمثیل پیش کی۔

عمدہ گیٹ اپ پر احمدیہ ہائی اسکول کے استاد جناب ایاز شیخ کو مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تمثیل کے لیے انعام دیا گیا۔ ایک خصوصی انعام جناب ضیاء الرحمٰن انصاری اثر صدیقی کی اثر انگیز نظامت پیش کرنے پر دیا گیا۔

تمثیلی شعرا کو انعامات جناب پرویز سردار، جناب شفیع مقری، جناب عبدالرحمٰن فقیہ، جناب طلحہٰ فقیہ اور جناب شان رب کے ہاتھوں دیے گئے۔ بزم کے سرپرست جناب فیضان احمد نے شریک سبھی شعرا کی خدمت میں مومنٹو پیش کیے۔ جناب عبدالعزیز انصاری کے شکریے پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

(ڈاک سے)

● رام پور، 22 / مارچ۔ رضا لائبریری میں پاکستان سے تشریف لائے مہمان شاعر سلامت اللہ خاں کے اعزاز میں ''ایک شام سلامت اللہ خاں کے نام'' کا انعقاد کیا گیا۔ محکمہ آثار قدیمہ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی کی صدارت اور طاہر فراز کی نظامت میں ہونے والی اس نشست میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونی شعرا نے بھی شرکت کی۔ چار گھنٹہ تک چلنے والی اس شعری نشست کا آغاز اظہر عنایتی کی نعت سے ہوا۔ درج ذیل شعرا نے شرکت کی۔

اظہر عنایتی، طاہر فراز، طارق قمر، سعید رامش، ہوش نعمانی، وقارالحسن صدیقی، عتیق جیلانی، نعیم مجی، عرفان وانش، مرتضیٰ فرحت، فرید صدیقی، آفتاب شمسی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

● بلند شہر، 25 / مارچ۔ ضلع زراعتی، انڈسٹریل اور ثقافتی نمائش میں آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت ندا فاضلی اور نظامت انور جلال پوری نے کی۔ آغاز نواز دیوبندی نے نعت پاک سے کیا۔ انتظامیہ

کمیٹی میں ڈاکٹر سریتا شرما، نرمل وید اور اے. ڈی. ایم. پربھانشو شری واستو کے نام شامل تھے۔ مندرجۂ ذیل شاعروں نے کلام سنایا۔

ندا فاضلی، پروفیسر وسیم بریلوی، مظفر رزمی، معراج فیض آبادی، منور رانا، نواز دیوبندی، جمیل خیرآبادی، انور جلال پوری، شاعر جمالی، کلیم قیصر، خورشید حیدر، پاپولر میرٹھی، شیاما سنگھ صبا، ڈاکٹر شیورتن لال برق، شبینہ ادیب، عدم گونڈوی۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی)

● مرادآباد، 31 مارچ۔ شہر امن کمیٹی کی جانب سے یہاں محلہ سرائے کشن لال چوک کھوکھران میں قومی یکجہتی کے نام سے منسوب کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق اور نظامت فاخر ادیب نے کی۔ میئر ڈاکٹر ایس. ٹی. حسن، ممبر اسمبلی سندیپ اگروال، شہر امن کمیٹی کے صدر منصور عالم نے مشترکہ طور پر مشاعرے کی شمع روشن کی۔ اس موقع پر سیاسی، سماجی اور صحافتی خدمات انجام دینے والی اہم شخصیات میں راشد صدیقی، جانی مراد آبادی، گگن بھارتی، فراست خاں وغیرہ کو اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ مشاعرے کا آغاز حق کانپوری اور ماجد دیوبندی نے بارگاہ رسالت مآب میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا۔ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا۔

ضیا ضمیر، فیصل سیوہاروی، فراز چنوری، نفیس کانپوری، صبا بلرامپوری، ہاشم فیروزآبادی، فاخر ادیب، طہور بدایونی، حق کانپوری، ماجد دیوبندی، ترنم کانپوری، جوہر کانپوری، گگن بھارتی، کشش وارثی، فرحت زیدی مشاعرے کے انعقاد میں شہر امن کمیٹی کے صدر کے علاوہ دیگر اراکین میں آصف آزاد، سید اطہر علی اور شکیل آزاد وغیرہ کا اہم تعاون رہا۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

● دربھنگہ، 26 مارچ۔ شہر کی ادبی انجمن بزم رہبر کے تحت 96 ویں ماہانہ شعری نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت حسن امام درد نے کی اور نظامت کے فرائض منور عالم راہی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر سابق اے ڈی ایم نیاز احمد شریک محفل ہوئے۔ اس شعری نشست میں مندرجہ ذیل شعرا کے اشعار کافی پسند کیے گئے۔

منظر الحق منظر صدیقی، ندا عارفی، محمد بابر خاں جالونی، منور عالم راہی، ابو محمد غفران، سکندر اعظم، ڈاکٹر احمد حسین آروی، حیدر عالم آروی، تسیم اختر برداہوی، ایڈوکیٹ کفیل احمد خاں، عطا عابدی، رہبر چندن پٹوی، نیاز احمد، حسن امام درد۔ اس شعری نشست میں خون چندن پٹوی، عمر فاروق رحمانی، امام الحق بیدار، فاروق اعظم انصاری، پروفیسر خلیل الرحمٰن سلفی، ایڈوکیٹ عرفان احمد پیدل اور جمیل اختر نے بھی اپنے اشعار سنائے۔ منور عالم راہی نے شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

● دربھنگہ، 30 مارچ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اشتراک سے مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں گذشتہ شب پاکستانی شاعر احمد فراز کی صدارت میں عالمی مشاعرہ ہوا، جس کا افتتاح مرکزی وزیر مملکت محمد علی اشرف فاطمی نے کیا۔ مہمان خصوصی مرکزی وزیر ڈاکٹر شکیل احمد تھے۔ نظامت ساغر خیامی نے کی۔ اس موقع پر عبدالباری صدیقی، تنویر حسن، مدن موہن جھا، اوم پرکاش کھیڑیا، اخلاق احمد عبدالغفور، سلطان احمد، اشرف حسین، ایس ایم جاوید اقبال، اعجاز الحق، ممتاز عالم اور بھوگیندر جھا وغیرہ موجود تھے۔ درج ذیل شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

احمد فراز، ندا فاضلی، حسن کمال، رضا حیدر، ممتاز راشد، وسیم بریلوی، ریحانہ نواب، اسرار جامعی، ساغر خیامی، شان الرحمٰن، تنگ عنایت پوری، ڈاکٹر شاکر خلیق، منور عالم راہی، حسن امام انور، ڈاکٹر امام اعظم، انیس صدری، امتیاز احمد صبا، ڈاکٹر حسن امام درد، ڈاکٹر آفتاب اشرف، پروفیسر ایم اے ضیا، ناشاد اورنگ آبادی، منظور الحق منظر صدیقی، مرتضیٰ سنجر، فاروق اعظم انصاری، نیاز احمد، سلطان احمد شمسی وغیرہ۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● پونہ اردو، ہندی، سندھی اور مراٹھی کی شاعرہ اور افسانہ نگار اندرا شبنم کے تازہ ترین افسانوی مجموعے "عبادت" کے اجرا کے سلسلے میں ایک تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ بزم اردو اعظم کیمپس کے تحت ڈاکٹر محبوب راہی کی صدارت میں منعقدہ اس تقریب میں "عبادت" کا اجرا جناب منور پیر بھائی نے کیا۔ مہمانان خصوصی میں قاضی مشتاق احمد، نذیر فتحپوری اور محترمہ سائرہ شامل تھے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد محترمہ سائرہ نے بزم اردو کی کارگزاریوں کی مختصر رپورٹ پیش کرتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ منور بھائی نے شال اور گلدستہ پیش کر کے اندرا شبنم کا اعزاز و استقبال کیا۔ صدر جلسہ اور مہمانان خصوصی کی خدمت میں بھی شالیں اور گلدستے پیش کیے گئے۔ محترمہ ممتاز پیر بھائی اور محترمہ عابدہ انعامدار نے اندرا شبنم کی تخلیقی سرگرمیوں کی داد و تحسین دیتے ہوئے اسے خواتین کی بیداری سے تعبیر کیا۔ محترمہ غزالہ مریم (ممبئی) نے اندرا شبنم کا مکمل تعارف اور "عبادت" پر تبصرہ پیش کیا۔ منور پیر بھائی کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ نذیر فتحپوری نے اندرا شبنم کی شعر و ادب کے مختلف میدانوں میں ہمہ جہت صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ قاضی مشتاق احمد نے "عبادت" میں شامل کچھ افسانوں کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے اندرا شبنم کو ایک کامیاب افسانہ نگار قرار دیا۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنی صدارتی تقریر میں

''عبادت'' میں شامل کم وبیش تمام افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان افسانوں کے کرداروں کی انفرادیت، کہانیوں میں رواں دواں قدم بہ قدم تجسس اور تحیر کو فنی خوبیوں سے تعبیر کیا۔ آخر میں اندرا شبنم نے نہایت جذباتی انداز میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے اعظم کیمپس کے ذمہ داران اور شرکائے محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ افسانہ کس طرح اور کیوں لکھتی ہیں، اپنے پاکستان سے ہجرت کے پس منظر میں نہایت متاثر کن انداز میں ساری تفصیلات پیش کیں۔ شبیر شاکر نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(ڈاک سے)

● حیدرآباد، 17/مارچ۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام حال ہی میں حیدرآباد میں منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کی افتتاحی تقریب میں یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کی شخصیت اور ان کے نصف صدی کے کارہائے نمایاں پر محیط کتاب ''میر کارواں......محمد شمیم جیراجپوری'' کا یونیورسٹی کے چانسلر پدم وبھوشن پروفیسر عبید صدیقی نے اجرا کیا۔ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے والی اس کتاب میں جناب آئی کے گجرال، پروفیسر گوردھن مہتا، پروفیسر مسعود حسین خاں، جناب جگن ناتھ آزاد، پروفیسر بی شیخ علی، پروفیسر سید ہاشم علی، پروفیسر ایم پٹھان، جناب ملک زادہ منظور احمد، جناب کبیر احمد جائسی، جناب منظور الامین، پروفیسر ایس اے وہاب قیصر اور علی گڑھ و حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے پرستاران محمد شمیم جیراجپوری کے منتخب مضامین شامل ہیں۔ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اشاعت مکتبہ جامعہ نئی دہلی کی جانب سے عمل میں آئی ہے۔ (روزنامہ ''سالار'' بنگلور)

وفیات

حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی

● گلبرگہ، جناب خواجہ پاشاہ انعامدار کی اطلاع کے بموجب حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی سابق سجادہ نشین بارگاہ عالیہ سیدنا گیسودراز بندہ نوازؒ کے سانحۂ ارتحال پر 2/اپریل 2007 بمقام ''خواجہ بندہ نواز ایوان اردو'' ایک تعزیتی اجلاس زیر صدارت جناب ولی احمد منعقد ہوا۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر کی قرأت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔ محترم وہاب عندلیب، ڈاکٹر عبدالحمید اکبر، ڈاکٹر رفیق رہبر، جناب محمد مجیب احمد اور جناب خواجہ پاشا انعامدار کے علاوہ دہلی سے تشریف لائے مہمانِ خصوصی جناب مظہر محی الدین نے مرحوم کی دینی، تعلیمی، ملی، تہذیبی، رفاہی وسماجی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ تعلیم کے میدان میں ان کی نمایاں خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب خواجہ پاشا انعامدار نے کہا کہ موصوف کے وصال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے پر ہوگا۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر نے کہا کہ خدمتِ خلق آپ کی زندگی کا مشن تھا۔ ڈاکٹر رفیق رہبر نے خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں مرحوم کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی تمام بارگاہوں میں ان کی شخصیت ایک مثالی شخصیت تھی۔ محترم وہاب عندلیب نے کہا کہ مرحوم نہایت خلیق، منکسار، معاملہ فہم اور انصاف پسند شخصیت کے حامل تھے۔ اعتدال ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ مختلف الخیال لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ تعلیم، ثقافت اور مذہبی امور میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جناب محمد مجیب احمد نے کہا کہ علمی، دینی وتعلیمی خدمات کے لحاظ سے ہم میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ بی بی رضا ڈگری کالج کے علاوہ انجینئرنگ اور میڈیکل کالج کا قیام ان کا اہم کارنامہ ہے۔ مہمانِ خصوصی جناب مظہر محی الدین نے کہا کہ مرحوم کی شخصیت بڑی قد آور تھی ان کی خدمات کی صحیح تصویرکشی سے زبان قاصر ہے۔ ایسی کم شخصیتیں ہوتی ہیں، جنھیں علم وعمل کا نادر نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

جناب ولی احمد نے صدارتی خطاب میں کہا کہ مرحوم کی رحلت پر سب کے دل رو رہے ہیں۔ ان کی خدمات ایک تفصیلی کتاب کی متقاضی ہیں۔ جناب ولی احمد نے اس توقع کا بھی اظہار کیا کہ مرحوم نے فیضانِ عام کے لیے جو ادارے قائم کیے ان کے جانشین حضرت سید شاہ خسرو حسینی صاحب ان اداروں کے ذریعے ان کے مشن کو جاری رکھیں گے۔

حضرت شاہ محمد محمد الحسینی نے 73 سال تک نہایت خوش اسلوبی سے درگاہ بندہ نواز گیسودراز کی سجادگی کے فرائض انجام دیے، کئی دینی وملی اداروں سے مرحوم کو خاص تعلق خاطر رہا۔ خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی کے علاوہ جامعہ نظامیہ، الامین ایجوکیشن سوسائٹی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر اداروں سے وابستہ رہے اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ جہاں تک خواتین کی تعلیم کا معاملہ ہے اس سلسلے میں مرحوم کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے عام تعلیم کے علاوہ پیشہ ورانہ تعلیم کے بھی کئی ادارے قائم کیے جن میں کے بی این انجینئرنگ کالج، کے بی این ٹیچنگ اینڈ جنرل ہاسپٹل، کے بی این اسکول آف نرسنگ اور کے بی این انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز شامل ہیں۔ ان تعلیمی اداروں سے صرف دکن ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے طلبہ بلالحاظ مذہب وملت مستفید ہو رہے ہیں۔ دینی تعلیم کے سلسلے میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے خلفِ اکبر کا قائم کردہ دارالعلوم دینیہ آج بھی قوم کے طلبہ وطالبات کی دینی تعلیم کی تکمیل کا اہم وسیلہ ہے۔

محمود عالم

• معروف ادیب، صحافی اور افسانہ نگار جناب محمود عالم کا 24 مارچ 2007 کی شام بعد نماز مغرب ریاض (سعودی عرب) میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 54 برس تھی۔ وہ گذشتہ چند برسوں سے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ مرحوم 1992 میں ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (WAMY) ریاض سے بحیثیت لائبریرین منسلک ہوئے تھے اور گذشتہ تین برسوں سے انٹرنیشنل اسلامک پبلشنگ ہاؤس، ریاض کے شعبۂ ادارت و تراجم کے انچارج تھے۔ دو ماہ قبل ہی وہ اپنی کمپنی کے دورے پر ہندوستان آئے تھے۔

مرحوم محمود عالم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چھ بیٹیاں اور چھ بیٹے ہیں۔ ان کی تدفین 26 مارچ کو ریاض میں ہوئی۔

محمود عالم صوبۂ بہار کے ضلع سیتامڑھی میں 14 جولائی 1952 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد یعقوب سے حاصل کی۔ جولائی 1960 میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں داخلہ لیا۔ وسطانیہ اول سے فاضل حدیث تک مدرسہ شمس الہدیٰ میں تعلیم حاصل کی۔ کلاس میں ہمیشہ اول رہے اور میرٹ اسکالرشپ لیتے رہے۔ 1966 میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1972 میں پٹنہ یونیورسٹی سے معاشیات میں بی۔اے۔ آنرز کا امتحان پاس کیا اور وہیں شعبۂ معاشیات میں داخلہ لیا اور نیشنل اسکالرشپ حاصل کی۔ 1977 میں معاشیات میں ایم۔اے۔ کیا۔ 1978 میں فارسی میں اور 1979 میں عربی میں ایم۔اے۔ کیا جس میں فرسٹ کلاس کے ساتھ فرسٹ پوزیشن بھی حاصل کی۔ 1980 میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔لب سائنس کا امتحان پاس کیا۔

ماہنامہ ''نور'' رامپور کے ساتھ معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے جولائی 1970 سے دسمبر 1972 تک وابستہ رہے۔ 1975 میں تقریباً چھ ماہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ ایس۔آئی۔او آف انڈیا کے ترجمان ''رفیق'' پٹنہ کے 1983 سے 1987 تک مدیر رہے۔ یہ کام اعزازی طور پر انجام دیا۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں جنوری 1976 سے 26 جولائی 1981 تک لائبریری اسسٹنٹ اور 27 جولائی 1981 سے ستمبر 1991 تک اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے کام کیا۔ نومبر 1991 سے اکتوبر 1992 تک امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، پھلواری شریف، پٹنہ کے ترجمان ہفت روزہ ''نقیب'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔ دسمبر 1992 سے مارچ 2004 تک ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (ریاض) میں لائبریرین کے منصب پر فائز رہے۔ مرحوم کی اہم تصانیف ہیں: مولانا مودودی اور معاصر علما، اختلافی مسائل میں مولانا مودودی کا موقف، عرب کا مجاہد (ناولٹ)، اردو ادب 1977-1976 (اشاریہ مضامین)، لمبے بحر کا ہم سفر (افسانوی مجموعہ)، تنقیح و تشریح (تبصرے اور تنقیدی مضامین)، صبر اور جہاد، زمانہ اس کو بھلانہ دے (خاکے)، تحصیل و ترسیل (تبصرے اور تنقیدی مضامین)، ایک دل ناصبور (افسانوی مجموعہ)، توضیح و تصریح (تبصرے و مضامین)، مثالی عورت (عربی کتاب: شخصیۃ المراۃ المسلمۃ کما یصوغہا الاسلام فی الکتاب والسنۃ کا اردو ترجمہ) تصنیف: ڈاکٹر محمد علی الہاشمی۔

(ڈاک سے)

حق سنبھلی

• سنبھل یکم اپریل۔ معروف شاعر'' حق سنبھلی'' کا طویل علالت کے بعد آج انتقال ہو گیا ان کی عمر 74 سال تھی۔ حق سنبھلی کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ ''متاع حق'' منظر عام پر آ کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ انتظار الحق سنبھلی فعال ادبی تنظیم ''باغ ادب'' کے کنوینر بھی تھے۔ روڈویز میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین میں سیاسی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ حق سنبھلی کے انتقال پر ادبی تنظیموں ادبستان زار، انجمن باغ ادب، رفیق میموریل سوسائٹی، یووا پرتبھا اکادمی وغیرہ نے تعزیتی جلسہ منعقد کر کے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

تبصرہ و تعارف

دیوان تاباں

مرتب: سرور الہدیٰ

صفحات: 414، قیمت -/210 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، نئی دہلی-110066

مبصر: محمود سعیدی، 3/141C-J، کرشنا گنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی-92

میر عبدالحئی تاباں اپنے زمانے کے خوش فکر شعرا میں شمار ہوتے تھے، اکثر تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے اور ان کا منتخب کلام بھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ''کیا کہا'' سے زیادہ ''کیسے کہا'' کی اہمیت تھی۔ مضامین اکثر فارسی سے مستعار ہوتے تھے اور دیکھا یہ جاتا تھا کہ کوئی مضمون کس خوبی سے اپنایا گیا ہے۔ میر و سودا جیسے منفرد شعرا بھی جنھوں نے اپنے فکر و خیال کی ایک الگ دنیا بسائی ہے، اس سے مستثنیٰ نہیں۔ بعض فارسی اشعار کے تو لفظاً بہ لفظ ترجمے ان کے ہاں مل جاتے ہیں۔ یگانہ نے غالب کے ہاں ایسے بیسیوں اشعار کی نشاندہی کی ہے جو فارسی گو شعرا کے اشعار سے ماخوذ ہیں۔ اس عمل کو اس زمانے میں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاباں صف اول کے شاعر نہیں ہیں لیکن دوسری صف کے شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی مستعار مضامین مل جاتے ہیں۔

جیسا کہ سرور الہدیٰ نے مقدمے میں اطلاع دی ہے۔ ''دیوان میر عبدالحئی تاباں'' لگ بھگ 67 سال پہلے 1935 میں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا تھا جو کلام عبدالحئی تاباں کے تین نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا۔ ان میں ایک نسخہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے انھیں دیا تھا، دوسرا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی کی ملکیت تھا اور تیسرا خود انجمن کے ذخیرے میں موجود تھا۔ عبدالحق صاحب نے تاباں کے کلام پر ان لفظوں میں اظہار خیال کیا تھا:

'' تاباں کا کلام صاف، سادہ اور شیریں ہے۔ تخیل کی بلند پروازی نام کو نہیں، خیالات بھی کچھ گہرے یا دقیق نہیں، عشق و محبت کی عام باتیں ہیں لیکن زبان اور بول چال کا لطف ضرور پایا جاتا ہے۔''

سرور الہدیٰ نے جو اس سے پہلے اشرف علی خاں فغاں کا کلام بھی مرتب اور شائع کر چکے ہیں، تاباں کے کلام کو بھی بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے دیوان تاباں کے، انجمن کے شائع کردہ نسخے کو بنیاد بنا کر کچھ قلمی نسخوں سے بھی متن کی تیاری میں مدد لی ہے اس لیے ان کا مرتب کردہ نسخہ زیادہ جامع ہو گیا ہے اور متن میں جو کوتاہیاں رہ گئی تھیں وہ بھی بڑی حد تک دور ہو گئی ہیں۔ سرور الہدیٰ نے دیوان کے آخر میں ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کر دی ہے جو اب زیادہ استعمال میں نہیں ہیں یا فارسی اور عربی سے ناآشنا نئی نسلوں کے لیے جن کے معنی و مفہوم کی وضاحت ضروری تھی۔

تحقیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے، سرور الہدیٰ بساط ادب کے نو واردوں میں ہیں مگر اپنی غیر معمولی لگن اور انہماک کی بدولت انھوں نے بہت جلد ایک امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اس سے پہلے ''دیوان اشرف علی فغاں'' کے علاوہ جو دیوان تاباں کی ترتیب ہی کی طرح تحقیقی نوعیت کا کام ہے، ان کی دو تنقیدی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ایک ''نئی اردو غزل'' اور دوسری ''سرخ و سیاہ'' جو بلراج مینرا کے افسانوں کے فنی تجزیے پر مبنی ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں نثار احمد فاروقی جیسے جید عالم کی توجہ اور تربیت حاصل رہی اور یہ ان کی ذہنی شرافت کی دلیل ہے کہ وہ اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ خوبی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

دیوان تاباں کی ترتیب میں سرور الہدیٰ نے ایک اور اہم کام یہ کیا ہے کہ معاصر تذکروں یا بعد کے تذکروں/تحریروں میں جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے یا ان کی شاعری زیر بحث آئی ہے، اسے ایک باب قائم کر کے ''میر عبدالحئی تاباں تذکرہ نگاروں اور ناقدین کی نظر میں'' کے زیر عنوان یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ بھی انھوں نے بہت تفصیلی لکھا ہے جس میں تاباں کے سوانحی حالات کے علاوہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

سرور الہدیٰ زبان و بیان کے معاملے میں محتاط ہیں لیکن مقدمے میں کہیں کہیں نظر کو ٹھوکر لگتی ہے، عجب نہیں یہ کمپوزنگ کی غلطیاں ہوں۔ مثلاً آنند رام مخلص کا شعر اس طرح لکھا گیا ہے:

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبائے کیست کے وای کنیم ما

دوسرے مصرعے میں 'کے' کی جگہ 'کہ' ہونا چاہیے 'کہ' کی جگہ 'کے' نثر میں بھی کہیں کہیں در آیا ہے مثلاً ''انتخاب سودا، مرتبہ رشید حسن خاں کا مطالعہ شروع کیا مگر افسوس کے --- اس میں بھی یہ شعر نہیں ہے۔''

یہ جملے بھی محل نظر ہیں ''انھوں نے تین قلمی نسخے سے متن تیار کیا ہے''، ''سب سے ضخیم اور مکمل نسخہ برج موہن دتاتریہ کیفی کا ہے'' اس کا امکان ہے کہ

تینوں نسخے میں شعر اسی طرح درج ہوگا" یہاں پہلے اور دوسرے جملے میں "نسخ" یا "نسخوں" کا محل ہے اور درمیانی جملے میں "نسخہ" ہونا چاہیے۔ فارسی تذکروں کی جو عبارتیں نقل ہوئی ہیں، ان میں بھی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ امید ہے آئندہ اشاعت میں سرورالہدیٰ ایسے مقامات پر نظر ثانی کرلیں گے۔

آئینۂ جہاں (جلد اوّل)

مرتب: جمیل اختر

صفحات: 600، قیمت -/266 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: عبدالرب، 265، سابرمتی ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کے کلاسیکی سرمایے کی بازیافت اور صحت متن کے ساتھ انھیں شائع کرنے کا جو جامع منصوبہ بنایا ہے قرۃ العین حیدر کا یہ کلیات اسی کا حصہ ہے۔ اس سلسلے کی پہلی جلد ہمارے پیش نظر ہے جس میں ان کے افسانوں کو یکجا کیا گیا ہے اس کی ترتیب و تصحیح کا کام جمیل اختر نے انجام دیا ہے اس کلیات کا نام عام ڈگر سے ہٹ کر "آئینۂ جہاں" رکھا گیا ہے۔ پہلی جلد میں کل 35 افسانے شامل ہیں جمیل اختر کے مطابق یہ افسانے ابتدا سے 1960 تک کے تحریر کردہ ہیں۔

مرتب نے قرۃ العین حیدر کے افسانوی سفر کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے جس میں پہلا دور ابتدا سے تقسیم ہند یعنی 1947 تک کا ہے۔ یہ قرۃ العین حیدر کی طالب علمی کا دور ہے چنانچہ مرتب کے بقول اس دور کی افسانہ نگاری میں طالب علمانہ زندگی کی ہنگامہ آرائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

دوسرا 1948 سے 1960 تک محیط ہے جو مرتب کے بقول انسانی رشتوں کے انہدام اور اپنے ملک کی تہذیبی ثقافت سے کٹ کر ایک نئے ملک میں جینے اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا زمانہ ہے۔

تیسرا دور۔ پاکستان سے واپسی اور قیام ممبئی یعنی 1960 سے 1970 کا زمانہ اور چوتھا دور۔ ملازمت سے سبکدوشی اور قیام دلی (1990-1970) پر مشتمل ہے۔ اس کلیات میں شامل جملہ افسانے مصنفہ کے نصف تخلیقی سفر کا احاطہ کرتے ہیں مشمولہ 35 افسانوں میں گیارہ افسانے یعنی "ایک شام"، "ارادے"، "خوابوں کے محل"، "دھندلکوں کے پیچھے"، "میری گلی میں ایک پردیسی"، "زندگی کا سفر"، "دوسرا کنارہ"، "شیشے کے گھر جو ٹوٹ گئے"، "پچھلے برسوں کی برف"، "وہی زمانہ وہی فسانہ"، "رام یہ کیسا گورکھ دھندا ہے" شائع شدہ ہونے کے باوجود اس سے پہلے قرۃ العین حیدر کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں تھے۔ جس کا اعتراف قرۃ العین حیدر نے اپنے پیش لفظ میں بھی اس طرح کیا ہے:

"اس جلد میں 35 افسانے شامل ہیں جن میں بہت سے افسانے ایسے ہیں جو اس سے قبل کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے البتہ رسائل میں شائع ہوچکے تھے اس کتاب کے مرتب جناب ڈاکٹر جمیل اختر صاحب نے انھیں تلاش بسیار کے بعد مختلف رسائل سے حاصل کیا ہے..... چنانچہ میں سمجھتی ہوں کہ فاضل مرتب نے یہ کام بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ کیا ہے۔"

تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں/ ایس.ایم جعفر

صفحات: 176، قیمت -/8.25 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: احمد کفیل، E-301، برہم پتر ہاسٹل، جے.این.یو، نئی دہلی 110067

ایس.ایم جعفر کی یہ کتاب "تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں" انگریزی میں لکھی گئی تھی جس کا اردو ترجمہ سعید انصاری نے کیا ہے۔ اس کتاب میں 1000 سے 1800 عیسوی تک مسلمانوں کے عہد حکومت میں تعلیم کی جو صورت حال تھی اس کا معروضی مطالعہ کیا ہے۔ ایس.ایم جعفر نے "تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں" لکھ کر تعلیم کے میدان میں بالعموم اور ہندوستانی تہذیب و تعلیم کے تعلق سے بالخصوص ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اسلامی عہد میں تعلیم کا خاص خیال رکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کا دنیا کے کسی بھی ملک سے تعلیم کے میدان میں مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ مطبعوں کا نام و نشان نہ ہونے کے باوجود ہزاروں کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں کتابیں موجود تھیں۔ آمدورفت کے وسائل اگرچہ نہیں تھے لیکن عوام میں تعلیم کا شوق اتنا تھا کہ جوق در جوق میلوں سفر طے کرکے تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔

ایس.ایم جعفر نے اس دور کی ان تعلیمی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کتاب کو تین اہم ادوار اور کل پندرہ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب "تمہید" کا ہے جس میں تعلیم کی اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ دوسرا باب "نظام تعلیم" کا ہے جس میں تعلیم کے سماجی و مذہبی پہلو کا ذکر ہے۔ تیسرے باب سے چھٹے باب تک کے ابواب کو "تعلیم کی ترقی" کے پہلے دور میں رکھا ہے اور مسلم حکمرانوں کے ابتدائی عہد میں تعلیم کی ترقی، صوبائی حکومتوں میں تعلیم کی ترقی اور مغلیہ عہد میں تعلیم کی ترقی سے متعلق بحث کی ہے۔ ساتویں باب سے لے کر دسویں باب تک کے ابواب کو "تعلیم کی ترقی" کے دوسرے دور کی سرگرمیوں کی تفصیلات کے لیے مختص کیا ہے۔ ان ابواب میں تعلیم کی نجی سرپرستی کی مختلف صورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں ابتدائی عہد میں صوبائی حکومتوں کے مختلف علاقوں میں خانگی نظام تعلیم اور دیہی مدرسوں میں

طریقۂ تعلیم جیسے موضوعات شامل ہیں۔ گیارھویں تا پندرھویں باب میں "تعلیم کی ترقی" کے تیسرے دور کو مرکز توجہ بنایا ہے۔ ان ابواب میں بطور خاص شاہی تعلیم، لڑکیوں کی تعلیم، تکنیکی تعلیم اور اردو کی نشو ونما کو موضوع بنایا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم عہد حکومت میں تحصیل علم کی راہ میں قربانیوں کی لاثانی مثالیں موجود ہیں۔ اساتذہ کے طبقے کی سماجی درجہ بندی، اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات، کلاس مانیٹر یا نائب استادی کا طریقہ اور عورتوں کی تعلیم جیسے امور پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ عہد حاضر میں تعلیم اور روزگار سے متعلق عورتوں کے لیے جو نظام قائم ہے وہ مسلم عہد حکومت میں بھی قائم تھا لیکن اخلاقی و روحانی تربیت مستزاد تھی۔ مفت تعلیم کا انتظام تھا۔ ہندوؤں میں ہر ذات کے لوگوں تک تعلیم کی روشنی جس طرح پھیلی اس میں مسلم عہد حکومت کا کلیدی کردار رہا ہے۔ سماج کا ہر خاص و عام طبقہ خواہ مسلمان ہو یا ہندو، مرد ہو یا عورت اور امیر ہو یا غریب سبھی کے لیے اس عہد میں تعلیم کو لوگوں کا پیدائشی حق سمجھا گیا۔ ان تمام پہلوؤں سے ایس ایم جعفر نے اس کتاب کے ذریعے روشناس کرایا ہے۔

تجزیات وتعبیرات/محبوب راہی

صفحات: 200، قیمت: -/225 روپے

ناشر: مصنف، بارسی ٹاکلی ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

مبصر: مشتاق احمد، رحم گنج، دربھنگہ (بہار)

محبوب راہی نے شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اپنی صحت مند فکر اور تنقیدی بصیرت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ زیرنظر کتاب "تجزیات وتعبیرات" ان کے بیس تاثراتی، تبصراتی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، اگرچہ مصنف نے اپنے پیش لفظ میں مشمولہ مضامین کی تعداد 19 لکھی ہے۔ ممکن ہے طباعت کے آخری مرحلے میں ایک مضمون کا اضافہ ہو گیا ہو۔ ان مضامین میں "ایک نظر اردو کے ماضی، حال اور مستقبل پر"، "اردو تعلیم اور روزگار کے مواقع و مسائل" اور "ودربھ کے اردو تعلیمی مسائل اور ان کا حل" لسانی نوعیت کے ہیں۔ بقیہ مضامین اصناف ادب اور مختلف ادبی شخصیات سے متعلق ہیں۔ ان گوناگوں موضوعات پر مبنی مضامین کے مطالعے سے ڈاکٹر راہی کے ادبی نظریات اور رویوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نصف درجن مضامین علاقائی نوعیت کے ہیں۔ لیکن یہ تاثراتی اور تنقیدی مضامین اس معنی میں دیگر مضامین سے زیادہ اہم ہیں کہ ان تخلیقی فنکاروں کے کام کا اعتراف اب تک نہیں کیا گیا ہے اور انھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر راہی نے کوثر جعفری، غنی اعجاز، مردان علی خاں نشاط، اکبر برار اور قاضی حسن رضا جیسی گمنام شخصیتوں کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال کے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ "اکولہ ضلع کا سرسری ادبی جائزہ"، "ودربھ میں طنز ومزاح کی صورت حال" اور "ناگپور میں بچوں کے ادب کی سمت و رفتار" کی اہمیت مسلم ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی مراکز سے دوردراز کے علاقوں میں بھی اردو زبان کس طرح پھل پھول رہی ہے۔ مظفر حنفی، ظہیر غازی پوری، عاصی کاشمیری اور قاضی مشتاق احمد کے فن سے متعلق لکھے گئے مضامین مضمون نگار کی غیر جانب دارانہ اور آزادانہ فکر کی گواہی دے رہے ہیں۔

کاگیروکی/مس چٹ سونا کی ماں

مترجم: سید جعفر امیر

صفحات: 292، قیمت: -/200 روپے

ملنے کا پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9۔اے، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

مبصر: شاذیہ عمیر، 352-ای-5، بی، منیر کا گاؤں، نئی دہلی-110067

"کاگیروکی" دسویں صدی عیسوی کا کلاسیکی جاپانی شاہکار ہے جسے سید جعفر امیر نے اردو کا قالب عطا کیا ہے کتاب میں زندگی کے مختلف آداب و اطوار کا احاطہ کیا ہے اور سماجی روایات خامیوں اور کمزوریوں کو واضح کیا ہے۔ یہ کتاب 944 میں پہلی بار رائج جاپانی زبان میں کیتایوشس (Kitayoshis) نے لکھی۔ یہ روزنامچے پر مبنی جاپان کی ایک نواب زادی مس چٹ سونا کی ماں جو خود مصنفہ بھی ہے اور شہزادہ (اصلی نام کینیے (Kaneie) کی ناکام شادی کی داستان ہے جو 954 میں محبت کے پہلے خط سے شروع ہوتی ہے اور 974 میں ان کی مکمل علاحدگی پر ختم ہوتی ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول روزنامچے سے زیادہ پہلے 15 سال کے حالات وکوائف پر مبنی سوانحی انداز کی تحریر ہے۔ باب دوم میں تین سال کی روداد ہے۔ جس کا آدھا حصہ روزنامچے کی صورت میں ہے۔ مصنفہ کی زندگی کا یہ وہ زمانہ ہے جب وہ اپنے اور شہزادے کے تعلقات کے بارے میں سوچتی ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شہزادے سے جو توقعات رکھتی ہے وہ کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

باب سوم میں تنہائی اور شہزادے کی بے وفائی کا شکوہ کرنے کے بجائے مصنفہ دنیا کو غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھتی ہے جس سے مصنفہ کی تحریر میں جذباتیت کی جگہ عقل و دانش کی کارفرمائی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی امیرزادیوں کی زندگی گھر کی چار دیواریوں تک ہی محدود تھی جبکہ امیرزادے اور شہزادے اس بات کے لیے پوری طرح آزاد تھے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلقات

رکھ سکتے ہیں جس سے قدیم ہندوستانی سماج اور اس دور کے جاپانی سماج میں کافی مماثلت نظر آتی ہے۔ اسی طرح بعض دنوں کو سعد اور بعض کو نحس تصور کرنے، دیوی دیوتاؤں کی عبادت اور انھیں خوش کرنے کے رجحان کے ساتھ شنتو اور بدھ مذہب کی رسومات بھی ہندوستانی تہذیب کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔

ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ اصل تحریر نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ خصوصاً غیر زبان کے اشعار کو اپنی زبان میں ترجمہ کرنا آسان کام نہیں تھا مگر مترجم نے فنی پیرائے میں تشبیہات و استعارات کا بھی خوبی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو قارئین کے درمیان دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

شری مد بھگوت گیتا (نغمۂ یزدانی) کی تفسیر و تعبیر/ اجے مالوی

صفحات: 235، قیمت: -/200 روپے

ناشر: مصنف، 1/1278، مالویہ نگر، الہ آباد، یو۔ پی۔ 211003

مبصر: سورج دیو سنگھ، شعبۂ اردو، مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ -1

''مہابھارت'' کے بھیشم پرب کے 35 ویں باب سے 42 ویں باب تک کا نام ''شری مد بھگوت گیتا'' ہے۔ اس میں انسانی زندگی سے متعلق دھرم، ارتھ، کام اور موکش سے متعلق معاملات خوبی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ ''شری مد بھگوت گیتا'' ایک ایسی تخلیق ہے جس میں بھگوان شری کرشن نے علم، عمل، عشق اور عرفان و آگہی پر زور دیا ہے۔

''شری مد بھگوت گیتا'' ہندوستانی ثقافت، اور عرفانیات کا عطر مجموعہ ہے۔ یہ مہابھارت کا اصل جوہر ہے۔ جس میں فلسفۂ عمل، فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات کو، جاذبیت، غنائیت فکری بلندی اور جمالیاتی رعنائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

''شری مد بھگوت گیتا کی تفسیر و تعبیر'' میں اجے مالوی نے اس الہامی کتاب کی تفسیر و تعبیر علمی انداز میں پیش کی ہے ساتھ ہی اس کی تاریخی اہمیت و افادیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ تین حصوں اور بائیس ذیلی عنوانات میں منقسم اس کتاب میں مصنف نے شری مد بھگوت گیتا کے فلسفے پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے حصۂ اول میں ''شری مد بھگوت گیتا'' کے معانی و مفاہیم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھگوت گیتا سنسکرت کے دو الفاظ 'بھگوت' اور 'گیتا' کا مجموعہ ہے، جسے ''شری مد بھگوت گیتا'' بھی کہتے ہیں۔ اس طرح ''بھگوت گیتا'' چار لفظوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے چاروں الفاظ یعنی شری، مد، بھگوت اور گیتا پر تفصیل روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی ''بھگوت گیتا'' کے زمانۂ تکمیل پر بھی اجمالاً گفتگو کی ہے۔

''شری مد بھگوت گیتا'' میں تقریباً 1700 شلوک ہیں جنھیں اجے مالوی نے اٹھارہ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ ان ابواب میں شری کرشن کے پند و نصائح کو بطور خاص موضوع بنایا ہے جو کروکشیتر کے میدان میں ارجن کی حوصلہ افزائی کے لیے کہے گئے تھے۔ حصہ دوم میں ارجن وشاد یوگ، ماہیت روح، عمل کا فلسفہ، عارفانہ ترک عمل، ترک عمل کا فلسفہ، تعلیم ضبط نفس، علم و عرفان کا فلسفہ، لافانی علم کا فلسفہ، اعلیٰ ترین علم کا فلسفہ، خدا کی عظمت کا فلسفہ، عقیدت کا فلسفہ اور مادّہ اور روح کے فرق جیسے اہم مسائل و موضوعات پر بحث کی ہے۔

آخری حصے میں مصنف نے اردو میں ''شری مد بھگوت گیتا'' کے اب تک کے شائع شدہ تقریباً 82 منظوم و منثور تراجم کی ایک طویل فہرست شامل کتاب کی ہے جو اس اہم موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

سہ ماہی نئی کتاب (1) (اپریل۔ جون 2007)

مدیر: شاہد علی خاں

صفحات: 248، قیمت: -/50 روپے زرسالانہ: -/200 روپے

ناشر: نئی کتاب پبلشرز، ڈی-24، ابوالفضل انکلیو، پارٹ -1، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

مبصر: رئیس احمد، 1/1007، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110022

''نئی کتاب'' کا یہ پہلا شمارہ ہے جو 'اداریے' اور 'حرف آخر' کے علاوہ سات حصوں میں منقسم ہے۔ اداریہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی (صدر مجلس ادارت) کے قلم سے ہے۔ موصوف نے اردو صحافت کی صورت حال پر اجمالاً روشنی ڈالتے ہوئے معیاری اور غیر جانب دارانہ صحافت کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے۔

پہلے حصے میں جو مختلف مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں۔ 'افسانے کی حمایت میں ---4' از جناب شمس الرحمٰن فاروقی، 'غبار آں سرکویم' از پروفیسر عبدالحق، 'فکشن یاترا: سائیکوڈراما کے دو مناظر' از شکیل الرحمٰن، 'جامعات میں اردو تحقیق۔ چند معروضات' از رؤف پاریکھ، 'قاری اور فکشن کی موجودہ تنقیدی روش' از احمد صغیر صدیقی، 'یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں' از شمیم طارق، 'آزادی کے بعد اردو تحقیق اور تنقید: ایک اجمالی مطالعہ' از پروفیسر عبدالستار دلوی، 'فن ترجمہ نگاری: چند معروضات' از پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، 'کلام غالب میں بیدلانہ جنون' از محمد انسر رہین، 'دبیر کا شعری رویہ' از ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، 'غالب کا دل: حقیقی اور جمالیاتی مفہوم' از ڈاکٹر وہاب قیصر، 'اردو کا شاہکار ناول --- کئی چاند تھے سرِ آسماں' از ڈاکٹر احمد محفوظ، 'سماجی پیکر تراشی: ایک تجزیہ' از ڈاکٹر توقیر احمد خاں، 'سماجی و سائنسی علوم: نصابی جبر کے سایے میں' از طارق احمد صدیقی، 'اختر الایمان کی نظم گوئی ایک جائزہ' از ڈاکٹر

محمد نعمان خاں، 'شہریار کی غزل گوئی کے چند نمایاں پہلو' از عمیر منظر، 'لوک گیت کی روایت (انتظاریہ)' از خالد محمود۔

'افسانے کی حمایت میں' قسط نمبر-1 تا 3، محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے مجموعۂ مضامین "افسانے کی حمایت میں" شامل ہیں۔ اس شمارے کا پہلا مضمون افسانے کی حمایت میں۔4 اسی سلسلے کی اگلی کڑی ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

ہر لحظہ، نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

'غبار آں سرکویم' میں پروفیسر عبدالحق نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی ادبی اور انتظامی خدمات کے علاوہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا ہے۔ ساتھ ہی پروفیسر محمد حسن، پروفیسر محمود الٰہی، رشید حسن خاں، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے علاوہ ڈاکٹر تاراچند کا ذکر بھی ضمناً در آیا ہے۔

"کئی چاند تھے سرآسماں" کا عنوان احمد مشتاق کے شعر۔

کئی چاند تھے سرآسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

سے ماخوذ ہے، محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے اس شاہکار ناول کا مطالعہ ڈاکٹر احمد محفوظ نے نہایت گیرائی اور گہرائی سے کیا ہے۔ یہ مقالہ اس ناول کی تقریب رسم اجرا منعقدہ 4 جنوری 2007 منعقدہ انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر، لودھی روڈ، نئی دہلی میں بھی پڑھا گیا تھا۔ "کئی چاند تھے سرآسماں" کی مرکزی کردار وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم ہے جو اردو کے مشہور شاعر نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی والدہ تھیں۔ داغ کے مقابلے میں وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم ہماری تاریخ کے صفحات میں ایک گمنام کردار سے زیادہ نہیں، لیکن اس ناول کی تخلیق کے بعد نہ صرف وزیر خانم (چھوٹی بیگم) بلکہ متعلقہ عہد کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی و نیم ادبی تاریخ کے جملہ نقوش اور تہذیبی رسم و رواج واضح طور پر سامنے آگئے ہیں۔ ناول نگار کا لب و لہجہ اور طرز بیان ناول کے کرداروں کے معیار و مزاج کے عین مطابق ہے، علاوہ ازیں کرداروں کی کثرت کے باوجود ناول کا پلاٹ نہایت مربوط و منظم ہے۔

"یادرفتگاں" اس شمارے کا دوسرا حصہ ہے جس میں مشفق خواجہ اور احمد ندیم قاسمی کے احوال و کوائف اور ان کی ادبی فتوحات پر بالترتیب انور سدید اور کشمیری لال ذاکر کے مضامین ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات ہیں۔ 'خامہ بگوش کی معیت میں' از انور سدید 'میرا آخری ساتھی، شجر سایہ دار احمد ندیم قاسمی' از کشمیری لال ذاکر۔ یہ دونوں مضامین مرحومین کے لیے خراج عقیدت بھی ہیں اور ان کے فکروفن کی تحسین بھی۔ تیسرے حصے میں مختلف شعرا کی نظمیں/غزلیں شامل ہیں، جن میں ڈاکٹر مظفر حنفی، مخمور سعیدی، احمد صغیر صدیقی، پروفیسر ظفر احمد نظامی، ظفر گورکھپوری، ہمایوں ظفر زیدی، خالد بن سہیل، خالد محمود، نظر بریلوی، عامر قدوائی، علی ظہیر، فاطمہ تاج، اسلم عبادی، عظمیٰ حسنی، حشمت اللہ شاہین، محمد ایوب راز، ظفر محیی، ملک زادہ جاوید اور نجمہ مصراشوق کی تخلیقات دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔

'طنز و مزاح' کے تحت مجتبیٰ حسین (غریبوں کو ہٹاؤ) اور اسد رضا (سال نو کی حرکتیں) کی تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں اپنی انفرادیت قائم کرچکی ہیں اور اسد رضا کی "تلخیاں" بھی مقبول ہورہی ہیں۔ "غریبوں کو ہٹاؤ" اور "سال نو کی حرکتیں" دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق پر مبنی ہیں۔

'کہانیاں' کے زیرعنوان مندرجہ ذیل چھ مختلف کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ 1. 'ردعمل' از قیصر تمکین، 2. 'نانو ہاؤس' از آصف فرخی، 3. 'مقبرہ' از پروفیسر صغرا مہدی، 4. 'ہم زاد' از یٰسین احمد، 5. 'چنے والا' از ڈاکٹر وسیم صدیقی، 6. 'لکھنؤ والے' از زیبا صدیقی۔

"تبصرے" کے تحت جن آٹھ کتابوں پر تبصرے شائع کیے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں۔ 1. 'ایک کتاب اور' (مصنف: یوسف ناظم) مبصر: رفیعہ شبنم عابدی، 2. 'میڈیا روپ اور بہروپ' (مصنف: سہیل انجم) مبصر: حقانی القاسمی، 3. 'اقبال ریویو' (اپریل 2006) (مجلس ادارت) مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں، 4. 'مولانا جلال الدین رومی کا پیام عشق' (مصنف: لطیف اللہ) مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں، 5. 'شگفتگی دل کی' (مصنف: ڈاکٹر خالد محمود) مبصر: نامی انصاری، 6. 'ماہنامہ حدیٰ اسلامی ڈائجسٹ' (عظیم صحابیات نمبر) (مدیر: اعلیٰ احمد مصطفیٰ صدیقی راہی) مبصر: عرفان وحید، 7. 'سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ' (مدیر: سید جلال الدین عمری) مبصر: محی الدین غازی، 8. 'ششماہی علوم القرآن' خصوصی اشاعت (جنوری 2006۔ دسمبر 2005) (مدیر: اشتیاق احمد ظلی) مبصر: محی الدین غازی، جملہ تبصرے زیرتبصرہ کتب سے کلی طور پر متعارف کراتے ہیں۔ آخری حصہ "خبرنامہ" ہے جس کے مطالعے سے اردو زبان و ادب سے متعلق ادبی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے۔

"حرف آخر" کے تحت شاہد علی خاں کا حوصلہ اور ان کی حق بیانی متاثر کرتی ہے۔ سہ ماہی "نئی کتاب" کی اس خوبصورت اور معیاری اشاعت کے لیے اس میدان میں محترم شاہد علی خاں کا طویل تجربہ شامل رہا ہے بہ اعتبار مجموعی سہ ماہی "نئی کتاب" کی اشاعت اردو صحافت کی تاریخ میں ایک نئے اور روشن باب کے اضافے کے مترادف ہے۔

□□□

محمد افضل خان (بچوں کا گوشہ)

حضرت امیر خسرو کی چند پہیلیاں

حضرت امیر خسروؒ کو ہندوستانی کا اولین شاعر کہا جاتا ہے۔ امیر خسرو دہلوی 1252 کو پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ جب امیر خسرو نو سال کے ہوئے تو ان کے والد سیف الدین محمود کسی لڑائی میں جاں بحق ہوگئے جس کے بعد خسرو کی پرورش کی ذمہ داری ان کے نانا عماد الملک نے اپنے ذمے لے لی۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا قیام بھی اکثر عماد الملک کے یہاں رہتا تھا۔ امیر خسرو کی خوش نصیبی تھی کہ کم عمری میں ہی انھوں نے اپنے پیر و مرشد کی قربت حاصل کرلی تھی۔ ایک روایت کے مطابق کسی دن امیر خسرو کے اشعار سن کر سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے ان کو اصفہانیوں کے طرز پر شعر کہنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ ابتدا میں امیر خسرو اپنے بڑے بھائی عزیز الدین سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں امیر خسرو نے خواجہ شمس الدین سے فنِ شاعری پر استفادہ کیا۔ امیر خسرو 1334 میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

امیر خسرو فارسی زبان کے عظیم شاعر اور منفرد نثر نگار تھے۔ ان کی عظمت کا اعتراف فارسی کے اکثر شعرا نے کیا ہے۔ امیر خسرو فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ امیر خسرو سے ہندوی زبان میں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دوہے، دو سخنے، ڈھکوسلے، گیت اور غزلیں وغیرہ منسوب کی جاتی ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر بچوں کے لیے دلچسپ پہیلیاں کہی ہیں۔ ان کی سبق آموز کہانیاں بچوں کے لیے ایک رہنما سے کم نہیں۔ ان کی بعض پہیلیاں ملاحظہ کریں۔

سب سکھین کا پیا پیارا
سب میں ہے اور
سب سو نیارا
وا کی آن مجھے یہ بھا
جا کی ہے بن دیکھے چا

جواب: حمد الٰہی

ایک پُرکھ ہے دمّی سنوارا
دنیا کا نستارن ہارا
وا کے چرنوں لاگ رہو
زیادہ بچن نہ منہ سے کہو

جواب: نعتِ رسول

ایک نار ہاتھی پر خاصی
جنور بیٹھا بیچ خواصی
اتا پتا مت پوچھو ہم سے
کچھ تو محرم ہوگی اس سے

جواب: محرم

لٹکے لٹکے اک تریا آئی
جو کچھ اس نے کری کمائی
گر تو چاہے اپنی گت
پیا کو ہرگز چھوڑے مت

جواب: روح

گیت گھاؤں تن میں لگو اور جیارہت بے چین
دکھت کھائے دکھ بڑھے سوکر وسکھی کچھ بین

جواب: عشق

آدھا مٹکا ساری پانی
جو بوجھے سو بڑا گیانی

جواب: کاجل

ایک ناری میں جب نر جائے
کالا منہ کر الٹا آئے
چھاتی گھاؤ اپنی سہے
من کے بچن پر آئے کہے

جواب: قلم دوات

چندر بدن زخمی تن پاؤں بنا وہ چلتا ہے
امیر خسرو یوں کہیں وہ ہولے ہولے چلتا ہے

جواب: روپیہ

جا گھر لال بلتیا جائے
دھرا ڈھکا گھر کا کھائے
تا کے گھر میں ڈھونڈ مچائے
لاکھن من پانی جائے

جواب: آگ

ماتا ناؤں دھرائے کے اور گرپ دلو پھیلائے
ڈائن سے کچھ کم نہیں جو پیٹ میں دھرتی جائے

جواب: زمین

ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
موتی اُس سے ایک نہ گرے

جواب: آسمان

بالا تھا جب سب کو بھایا
بڑھا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں
ارتھ کرو نہیں چھاڑو گاؤں

جواب: دیا

بچو! فارسی اور اردو کا میل جول بہت پرانا ہے۔ یہ دونوں زبانیں بہت میٹھی اور ملی جلی تہذیب کی پہچان ہیں۔ امیر خسرو نہایت پر مزاح اور خوش مزاج انسان تھے۔ فنِ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مشہور ہندوستانی ساز ستار امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو کی ایک اور دلچسپ پہیلی ملاحظہ کریں۔

جل کر اُجیے جل میں رہے
آنکھوں دیکھا خسرو کہے

جواب: کاجل

□□□

پتہ:
76/4, SRI Nath Porel Lane,
Hawrah-711101 (W.B.)

تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی، چنئی کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند مشاعرے سے پہلے ریاست کے چند شعرا کو انعام و اعزاز دیے گئے۔ تصویر میں دائیں سے: اکادمی کے سکریٹری کے ایم اشفاق الرحمن، جناب کے کیشن سکریٹری برائے اعلی تعلیم، بزرگ شاعر جناب کاش بدری، وزیر برائے اعلی تعلیم ڈائرکٹر، تملناڈو اردو اکادمی کے وائس چیئرمین نواب محمد عبدالعلی اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس۔

تملناڈو اردو اکادمی کے کل ہند مشاعرے میں شریک ہونے والے شعرا۔ دائیں سے: پرتپاو اجپائی، شمس تبریزی، اصغر ویلوری، محمد امان اللہ، حسن کاظمی، اشفاق الرحمن مظہر، مظفر رزمی، مخمور سعیدی، افتخار امام صدیقی، احمد بلیاوی اور رؤف خیر۔

... محمد کالج ترو چراپلی کا جلسہ تقسیم اسناد۔ گذشتہ سال سنٹر سے فارغ 35 طلبہ کو اچھی ملازمتیں حاصل ہو چکی ہیں۔ طلبہ اور طالبات کے والدین نے اس موقع پر قومی اردو کونسل کی خدمات پر خوشی کا اظہار کیا اور ترو چی میں CAM-DTP سنٹر کے قیام پر قومی اردو کونسل اور حکومت ہند کا شکریہ ادا کیا۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication 24/04/2007

URDU DUNIYA Monthly, May 2007, Vol. 9, Issue: 5
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D. Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

زرسالانہ بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی [illegible]یں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066. Editor Dr. Ali Javed. Tel: 26103381, 26103938